یادِ رفتہ

خلیل احمد نینی تال والا

پبلشر : ہمدرد پیکیجز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

قیمت : -/300روپے

ملنے کا پتہ: ٹچ می ھاؤس

43-1/H بلاک 6 پی ای سی ایچ ایس

راضی روڈ کراچی Tel: 021-4536424-30

(کتاب کی آمدنی معذور بچوں کے ادارے ''دارالسکون'' کشمیر روڈ کراچی کیلئے وقف کردی ہے)۔

۲/اپریل ۲۰۰۷ء

جناب خلیل احمد نینی تال والا تجارتی حلقوں کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں کبھی کبھی ان کا ایک آدھ مضمون روزنامہ جنگ میں آتا ہے جس میں وہ ملکی حالات پر تبصرہ کرتے ہیں، زیرِ مطالعہ ان کی کتاب یادِ رفتہ ان کے بچپن سے اب تک کے حالات زندگی ہیں جس میں سے بیشتر کا تعلق ان کی کاروباری زندگی اور سیر وسیاحت سے ہے کم عمری سے ہی وہ بڑے حوصلے اور لگن سے تجارتی میدان میں اُترے اور کامیابی سے ادویات کے کاروبار سے منسلک رہے اس سلسلے میں انہوں نے مختلف ممالک کے دورے بھی کئے۔ جاپان میں امریکن سفارت خانے میں جب ان کا پاکستانی پاسپورٹ زمین پر پھینک دیا گیا تو وہ دَھرنا دے کر بیٹھ گئے کہ جب تک میں کونسل جنرل سے نہیں مل لوں گا جاؤں گا نہیں اور مل کر رہے اور اس نے معذرت کی، چونکہ کرکٹ کا بھی بہت شوق تھا اس ہی مناسبت سے کرکٹ کے کھلاڑیوں سے بھی خلیل صاحب کی دوستی رہی، لندن پہنچے تو ظہیر عباس کے مہمان رہے کہیں جانا تھا تو ان کی بیگم نے بتایا کہ ظہیر عباس گاڑی چلاتے چلاتے ہوئے سو جاتے ہیں اس لیے ان کی فرمائش پر بغیر لائسنس کے کار چلائی۔ اس بات کا بھی انہیں بڑا غم رہا کہ عمران خان نے کیوں جاوید میاں داد کے ۲۸۰ رن پر پاکستان کی اینگ ڈکلیر کردی، اسی مہم جوطبیعت کی وجہ سے پیرس میں تفریحاً ریس کورس کے کھوڑے پر بیٹھ گئے جس نے سرپٹ دوڑنا شروع کردیا تھا لاکھ شور مچایا لیکن اردو انگریزی سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ آخر کار غیبی امداد آئی اور ایک انگریز دان نے جان بچائی۔ نیویارک میں یہ دیکھا کہ بجلی گئی تو شہریوں نے دوکانیں لوٹ لیں۔

خلیل احمد نینی تال والا نے اپنے حالات زندگی کا ذکر کرتے ہوئے تجارتی میدان میں اپنی جدوجہد اور زندگی کے اتار چڑھاؤ کا بھی جا بجا ذکر کیا ہے جن سے گزر کر وہ ایک کامیاب تاجر بنے لیکن

یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ قومی سطح پر مدح سرائی کی مستحق ہو جو بات قابل ذکر ہے وہ ان کی تعلیمی اور فلاحی خدمات ہیں انہوں نے کے۔ این۔ اکیڈمی نامی ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی ہے جو اپنی مثال آپ ہے، ۱۱۲۵ ایکڑ پر یہ اسکول جہاں ۲۰۰ طلباء کے لیے ہاسٹل کا انتظام ہے چڑیا گھر، سوئمنگ پول، جمنازیم، کھیل کے میدان، لائبریری اور دوسری سہولتیں ہیں کراچی کے مضافات میں ہے اور بہت کامیابی سے چل رہا ہے مجھے اُمید ہے کہ وہ اس اسکول کو تجارتی بنیادوں پر نہیں چلائیں گے اور خاص طور سے غریب اور نادار بچوں کا خیال رکھیں گے۔ اس طرح مجھے اُمید ہے وہ دردمندی کے ساتھ ملک اور قوم کی خدمت کرتے رہیں گے۔

(جسٹس حاذق الخیری)

خلیل نینی تال والا صاحب سے شناسائی کو دس برس ہونے کو آئے۔ ان کی دو کتابوں کی رونمائی میں بھی شریک ہونے کا موقع ملا۔ اور ان کی بنائی ہوئی خوب صورت درسگاہ کے این اکیڈمی میں بھی کئی دفعہ جانا ہوا۔ اُن کے متنوّع موضوعات پر تحریر کئے ہوئے اخباری کالم بھی پڑھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

خلیل صاحب ایک اچھے دوست، کامیاب کاروباری شخصیت اور متحرک انسان ہیں۔ زندگی کے بارے میں نہایت مثبت رویہ رکھتے ہیں۔ پاکستان اور عوام سے دلی محبت کرتے ہیں۔ خاندانی ٹرسٹ کے ذریعہ سے کے این اکیڈمی کی تعمیر اور ایک بہت اعلیٰ معیاری درسگاہ کا قیام ان کی تعلیم اور عوام سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ان کی انتھک محنت، خلوص اور لگاؤ سے ایک کامیاب اور بھرپور زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے متعدد بیرونی دوروں اور سفر کی روداد دلچسپ بھی ہے اور ہمارے سیکھنے کیلئے بھی اس میں بہت کچھ ہے۔

میں اُن کی صحت اور کامیابی کیلئے دعا گو ہو۔

معین الدین حیدر

لیفٹننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر

۲۲ مارچ ۲۰۰۶ء

تحریر سادہ مگر دل میں اُترنے والی:

خلیل احمد نینی تال والا کی ہمت قابلِ داد ہے کہ وہ اپنے صنعتی منصوبوں میں بھی اضافہ کیئے جارہے ہیں اور اپنی کتابوں میں بھی۔ان کا صنعتی سفر بھی جاری ہے۔اور قلمی سفر بھی۔نہ جانے انہیں اپنی زندگی کے سفر کو قارئین کے سامنے لانے کا خیال کیوں آ گیا۔عام طور پر خودنوشت بڑھاپے میں شائع کی جاتی ہے۔خلیل صاحب جوانی میں ہی اپنی آٹو بائیوگرافی لے آئے ہیں۔وہ سب کام جلد کرنے کے عادی ہیں۔آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتے۔

خلیل صاحب سے ہماری رفاقت کو تین دہائیاں ہورہی ہیں۔تعلق کا آغاز بہت تلخ ہوا تھا،لیکن بعد میں یہ شیرینی میں بدل گیا۔اس تلخی کو اب بیان کرنا ضروری نہیں ہے،لیکن اس واقع کو خلیل صاحب اپنی کامیابیوں کا آغاز قرار دیتے ہیں۔ہمارے ہاں رپورٹ شائع ہونے پر یہ اگر جیل نہ گئے تو بہت سی شخصیتوں سے ملنے سے محروم رہتے منظرعام پر نہ آسکتے۔ان کے کاروبار میں اتنی وسعت نہ ہوتی۔ان میں محنت کرنے کا جذبہ شدت سے موجود ہے۔تخلیق کے رُجحانات بھی ہیں۔قدرت کے بھی قائل ہیں۔خوب سے خوب تر کی جستجو میں بھی رہتے ہیں۔وہ یقیناً ایک کامیاب تاجر اور صنعتکار ہیں۔اب تو ماشاءاللہ ان کی دوسری نسل بھی کاروبار میں شامل ہوچکی ہے۔صاحبزادوں کی شرکت ان کو مزید کامیابیوں کی طرف لے جارہی ہے،ان کی نئی نسل بھی ان کی طرح ہی باہمت ہے۔خلیل صاحب بھی ہمیشہ زیرلب مسکراتے نظر آتے ہیں۔ان کے صاحبزادے بھی اسی طرح آنکھوں میں ایک مخصوص چمک لیے لبوں پہ مسکراہٹ سجائے دکھائی دیتے ہیں۔اپنے ابو کے دوستوں کا دل سے احترام کرتے ہیں۔اوران سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔اب کچھ خودنوشت پر بھی بات ہوجائے۔خلیل صاحب کی تحریر بہت سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ان کے کالم قارئین میں اس لئے پسند کیئے جاتے ہیں کہ وہ ان میں اپنی بڑائی اور بہت کچھ جاننے کا رعب نہیں ڈالتے،جو سوچتے ہیں،دیکھتے ہیں،محسوس کرتے ہیں،اسی

طرح بیان کردیتے ہیں۔تعلق اگرچہ خواص سے ہے۔لیکن عوام کے دکھوں اور سکھوں کی خبر رکھتے ہیں۔کسی ایک موضوع سے جڑے نہیں رہتے۔جو باتیں بھی عوامی حلقوں میں ہورہی ہوتی ہیں انہیں سنتے ہیں،پھران کو اپنے قارئین اور متعلقہ حکام تک پہنچاتے ہیں۔

یادِ رفتہ : اپنے اندر بہت تنوع رکھتا ہے۔ان کی شخصیت طرحدار ہے ان کا حلقہ وسیع ہے، ان کے شعبے مخصوص نہیں ہیں،اس لئے انہیں بہت زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔تجربات کا دائرہ بہت وسیع ہے،اپنے کاروبار کی دھن میں انہوں نے تقریباً ساری دنیا گھوم لی ہے۔امریکہ،کینیڈا،یورپ، بھارت،چین اور نہ جانے کہاں کہاں ہوآئے ہیں۔اوراب انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں بھی ان تجربات میں شامل کریں۔اس سفر میں ایک بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ یہ کہیں بھی ہوں۔ان کے اندر کا پاکستانی بیدار رہتا ہے۔اور یہ جو کچھ مثبت،منفی،اچھا،برا دیکھتے ہیں۔ایک پاکستانی کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ان کی خواہش ہوتی ہے کہ جو اچھا ہے۔وطن عزیز بھی اسے اپنائے اور جو برا ہے وہ اپنے ملک میں بھی نہ ہو۔انہیں سخت دکھ ہوتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ ملک اور ادارے جنہیں ہمارے ہم وطن پاکستانیوں نے تعمیر کیا مستحکم کیا اب وہ ملک اور ادارے تو آگے نکل گئے ہیں۔ترقی اور خوشحالی ان کا مقدر بن چکی ہے۔ہم پستیوں میں اترتے جارہے ہیں۔یہ احساس زیاں ہی ہے اگر کسی قوم کو اپنے نقصان کا احساس ہوجائے تو یقیناً ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتی ہے۔زیاں کا یہ احساس اس کتاب میں ہر سطر میں جاگتا،کروٹیں بدلتا نظر آتا ہے۔

ان کی زبان بہت سادہ ہے۔ایک عام پاکستانی جس لہجے میں بات کرتا ہے۔جوالفاظ،محاورے،تراکیب استعمال کرتا ہے ان کے ہاں بھی یہی کچھ نظر آتا ہے اس لئے عام قارئین میں یہ خودنوشت یقیناً پسند کی جائے گی،میں خلیل احمد نینی تال والا کو ان کی اس مزید ایک تخلیق پر مبارکباد پیش کرنا چاہوں گا اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید کتابیں لکھنے کی توفیق دے۔

محمود شام

اب تو یہ روایت بن چکی ہے کہ جب بھی ہمارے خلیل احمد نینی تال والا صاحب کوئی کتاب لکھیں تو اس پر مجھے کچھ نا کچھ کہنا ہوتا ہے، اس بار محض کہنے کے بجائے لکھنے کا حکم ہے۔ ہمارے ممدوح کی اتنی جہتیں ہیں کہ وہ اگر مکمل آپ بیتی لکھنا چاہیں تو جانے کتنے دفتر درکار ہوں۔ وہ پہلے بھی اپنے سیاسی وسماجی سفر کی داستان لکھ چکے ہیں۔ اس بار انہوں نے اپنی کاروباری شخصیت کے نشیب وفراز تحریر کئے ہیں۔

دنیا بھر میں کامیاب کاروباری شخصیتیں اپنی کامیابی کے تجربے کو تاریخ کے پردوں کے سپرد کرتی ہیں محض، اس لئے نہیں کہ اس سے انکا امیج بلند ہوگا بلکہ خاص طور پر اس لئے کہ انسانیت ان کے تجربے سے استفادہ کرے۔

برادرم خلیل احمد نینی تال والا کی کاروباری زندگی یقیناً ایسی ہے کہ وہ ایک خودنوشت سوانح عمری کا موضوع بن سکتی ہے۔ انہوں نے اسے بڑے ہی مختصر انداز میں رقم کیا ہے۔ اتنی بھی جلدی کیا تھی یہ تو وہ داستان ہے جسے کہنے والا کہتا جائے اور سننے والا سنتا رہے۔ مگر شاید وہ اپنے قارئین کا زیادہ وقت ضائع کرنے کے قائل نہیں انہوں نے بڑے اختصار، صاف گوئی اور سیدھے سادے انداز میں اپنی شخصیت کے اس سفر کی داستان بیان کی ہے جو آپ کو بھی اسبابِ سفر باندھ لینے پر اکساتی ہے۔

(سجاد میر)

گیارہ سال کی عمر سے اپنے والد محمد اسماعیل نینی تال والا کے ساتھ کاروبار سے منسلک ہوگیا تھا۔ اُس وقت میں سندھ مدرستہ الاسلام کراچی میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اسکول سے سیدھا دوکان پر آتا تھا۔ والد صاحب کا کاروبار جنرل مرچنٹ ڈائیز کا تھا۔ میریٹ روڈ پر واقع کچھی گلی نمبرا نزد ڈینسو ہال کراچی میں درمیانہ درجہ کی ہول سیل کی دوکان تھی۔ شروع سے مجھے یہ جنرل مرچنٹ ڈائیز کا کاروبار پسند نہیں تھا۔ والد صاحب سے ادویات کے کاروبار کرنے کی اجازت طلب کی جو انہوں نے دے دی کیونکہ اُس گلی میں 80 فیصد ادویات کی دوکانیں ہی تھیں اور 20 فیصد دیگر اشیاء فروخت ہوتی تھیں، خدا کا کرنا کہ ادویات کا کاروبار جلد ہی چمک اُٹھا کیونکہ میں بڑی محنت سے خریداروں سے ڈیل کرتا تھا۔ اس کاروبار میں میرے جڑواں بھائی محمد الیاس بھی شریک تھے۔ اتنی چھوٹی عمر میں کاروبار کرتے دیکھ کر خریدار رشک بھی کیا کرتے تھے۔ یاداشت ماشاء اللہ بہت تیز تھی چیزوں کی ترتیب اور اُن کی قیمتیں زبانی یاد رکھنا بھی ایک منفرد تجربہ تھا۔ ادویات کا کاروبار آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا کہ اچانک ملک میں مارشل لاء لگ گیا یہ 1958ء کا زمانہ تھا۔ ادویات اُن دنوں بہت بلیک سے فروخت ہوتی تھیں۔ تمام دوکاندار صاحبان اس غیر متوقع مارشل لاء سے نابلد تھے اور گھبرا رہے تھے، چند ہی دنوں میں فوج نے جگہ جگہ چھاپے مارنے شروع کردیئے سب گھبرا گئے اور کنٹرول نرخ پر مال فروخت کرنے لگے۔ انہی دنوں والد صاحب کے ایک دوست جوٹھہ سے آیا کرتے تھے چند ماہ سے وہ کراچی نہیں آرہے تھے۔ اُن کے حصے میں کچھ رقم بقایا تھی۔ جو وصول کرنی تھی۔ والد صاحب نے کہا کہ آج اتوار ہے، 18 اکتوبر 1958ء کے دن ٹھٹہ چلتے ہیں رقم بھی وصول ہو جائے گی۔ اور سیر وتفریح بھی کرلیں گے۔ چنانچہ والد صاحب کے ساتھ صبح ہی صبح بس سے کراچی سے ٹھٹہ روانہ ہوگیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا سفر تھا جو کاروبار کی نیت سے صرف چودہ سال کی عمر میں شروع کیا۔ وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ جن صاحب سے ہم ملنے گئے تھے چند ماہ قبل اُن کے ساتھ حادثہ پیش آگیا۔ اُن کی بس جوٹھہ آرہی تھی

زبردست بارش کی وجہ سے گجونالہ (ٹھٹہ سے تقریباً بیس میل پہلے) میں گر گئی تمام مسافر اُس نہر میں ڈوب گئے۔ مرحوم کے بھائی نے ہماری خاطر مدارت بھی کی اور وہ رقم بھی ادا کر دی۔ ایک رات ہم ٹھٹہ میں ٹھہر گئے۔ دوسرے دن وہاں کی بادشاہی مسجد اور دیگر مزارات وغیرہ دیکھے۔ اس وقت ٹھٹہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا چند ہزار کی آبادی تھی ایک ہی بازار تھا جس کا نام شاہی بازار تھا۔ چلتے وقت ہمارے میزبان جن کا نام سید اعجاز حسین تھا، انھوں نے مجھے پھر آنے کی دعوت دی اور ادویات کا ایک بہت بڑا آرڈر بھی دیا۔ اس کے بعد تو ٹھٹہ گویا ہمارا دوسرا گھر بن گیا سال ہا سال تک ہر ہفتہ کی رات جاتا اور اتوار کی شام واپس کراچی آتا۔ کاروبار اور تعلیم ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ سندھ مدرسہ سے میٹرک کیا تعلیم جاری رکھنے کے خیال سے پھر گورنمنٹ کامرس کالج میں داخلہ لے لیا۔ اب کاروبار کے سلسلے میں ٹھٹہ سے حیدر آباد، پھر سکھر، ٹنڈو آدم، نواب شاہ تک ہر چھٹی والے دن جانا ہوتا تھا اور بڑھتے بڑھتے اب لاہور، پنڈی اور پشاور تک کاروبار پھیل گیا۔ ہر ماہ چند دن میں یہ دورے مکمل کر لیتا تھا۔ کالج سے فارغ ہو کر تو ان شہروں کے دورے گویا روزمرّہ کے معمول بن گئے۔ دراصل ان تجارتی دوروں سے منافع بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا اور پورے مغربی پاکستان میں تمام ادویات کے مالکان سے شناسائی بھی ہو چکی تھی۔ دل ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا تھا۔ گویا پاؤں میں پہیے لگ گئے ہوں سوچا چلیں ایک آدھ چکر مشرقی پاکستان کا بھی لگایا جائے۔ پہلے ہی دورے میں کافی منافع ہوا جو مغربی پاکستان کے دوروں سے کہیں زیادہ تھا۔ اب تو ڈھاکہ اور چٹاگانگ آنا جانا معمول بن گیا۔ مغربی پاکستان کے دورے کم ہوتے گئے مشرقی پاکستان کے دورے بڑھتے گئے یہ 1967ء کا زمانہ تھا۔ اگرچہ بنگالی حضرات ہمارا بڑا خیال رکھتے تھے مگر ہر غیر بنگالی کو خواہ وہ پنجابی ہو پٹھان یا مہاجر ہو سب کو بہاری کہتے تھے۔ ابھی تک شیخ مجیب الرحمٰن کا سیاسی عمل دخل نہیں تھا تعصب کی ہوا نہیں چلی تھی۔ عوام پرسکون تھی۔ دونوں صوبے ہم آہنگی اور دوستی سے سرشار تھے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ بنگالی بہت سیدھے

چاس مینڈوزا کے فیکٹری آفیسر کے ساتھ گروپ فوٹو

چاس مینڈوزا کے فیکٹری ورکر کے ساتھ پکنک 1972ء

سادھے لوگ تھے۔کاروبار تمام غیر بنگالیوں کے ہاتھ میں تھا۔بنگالیوں میں صرف ہندو تاجر ہوتے تھے۔90 فیصد غریب اور مزدوروں کی تعداد تھی جو رکشہ،ٹھیلا یا نوکری پیشہ ہوتے تھے ۔ہندو البتہ خوش حال تھے وہ ان بنگالیوں کو بھڑکاتے تھے یہ سالا "بہاری" (یہ بنگالیوں کی بُری گالی تھی) مغربی پاکستان سے آکر یہاں کاروبار کرتا ہے اور گھر مغربی پاکستان میں بناتا ہے یہاں کی کمائی یہاں سے لوٹ کر لے جارہا ہے۔حالانکہ خود یہ ہندو بنگالی تاجر اپنا سرمایہ اور گھر ہندوستان میں بناتے تھے۔کیونکہ پہلے ملٹری ایکشن میں یہ سب ہندو بھاگ کر آسانی سے سرحد پار کر کے ہندوستان پہنچ گئے تھے۔ بہرحال ایسا بھی موقع آیا کہ 1968ء میں اب علیحدگی کی بات کی جانے لگی تھی جن میں ہندو پیش پیش تھے۔میں اکثر مشرقی پاکستان آتا جاتا تھا تو مجھے کوفت ہوتی تھی کہ یہ بہت خطرناک کھیل کھیلا جارہا تھا۔ 1967ء میں ایک دن میں نے سوچا اگر بنگال الگ ہوگیا تو کیوں نہ پاکستان سے باہر جایا جائے۔یعنی خوب سے خوب تر کی تلاش تھی۔ڈھاکہ سے ایک دوست کے ساتھ ہانگ کانگ روانہ ہوگیا۔اُن دنوں پاسپورٹ کا حصول بہت مشکل تھا۔مگر جب انسان کوشش کرے،نیت صاف ہوتو راستہ خود بخود نکل آتا ہے۔راتوں رات پاسپورٹ بھی بن گیا۔صرف پانچ دن میں (یعنی 18 مارچ 1967ء سے 23 مارچ 1967ء تک) ہم ہانگ کانگ کا پہلا غیر ملکی تجارتی دورہ کر کے واپس بھی آگئے۔کیونکہ والدین کو ڈر سے نہیں بتایا تھا کیونکہ خدشہ تھا کہ اتنے بڑے دورے کی اجازت نہیں ملے گی۔لہذا جلدی جلدی واپس لوٹ آئے۔ اس غیر ملکی دورہ ہانگ کانگ سے ایک نئے تجارتی تجربہ سے آگاہی ہوئی نیا ملک نئی تہذیب نئی زبان جو چینی تھی سننے کو ملی۔پہلی مرتبہ احساس ہوا ہمارے ملک میں جو چائنیز کھانے کھائے جاتے ہیں۔وہ بالکل پاکستانی اسٹائل کھانے تھے۔اصلی چائنیز کھانے تو ہم ہانگ کانگ میں ہی کھا سکے۔کیونکہ وہ بالکل پھیکے اور پتلے تھے۔کاروبار کے لحاظ سے ہانگ کانگ پاکستان سے بہت آگے تھا۔نئی نئی اور بڑی بڑی عمارتیں،باغات،پہاڑوں پر مشتمل بہت چھوٹا اور منفرد

بی ایم وائی جمعیت ہسپتال کے وارڈ کا افتتاح کر کے دُعا مانگتے ہوئے گروپ فوٹو

1971ء نیویارک مجسمہ آزادی کے سامنے

ملک دیکھنے کو ملا۔خوب کاروبار کیا نئے نئے آئٹم بنوائے۔اب معلوم ہوا کہ لوگ کیوں ہانگ کانگ جاتے تھے کیونکہ آپ نے جیسا بھی مال بنوانا ہو خواہ وہ جاپانی کی نقل ہو یا امریکہ و یورپ کی وہ ہو بہو بنادیتے ہیں اور قیمتوں میں بھی بہت کم لاگت کی ہوتی ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ وہ مغربی ممالک کی طرح ٹھوس اور پائیدار نہیں ہوتی ،اُس زمانے میں ہماری قومی ایئرلائنز پی آئی اے ہانگ کانگ ڈائرکٹ نہیں آتی تھی بلکہ چائنا کی معرفت بذریعہ ٹرین کینٹن (CANTON) سے ہانگ کانگ آنا پڑتا تھا اور ایک رات کینٹن میں ہوٹل میں گزارنا پڑتی تھی۔چائنا میں کوئی بھی انگریزی نہیں جانتا تھا۔ ماؤزے تنگ کا دور دورہ تھا ہر گلی ہر سڑک اور ہر چوک پر ماؤزے تنگ کی تصاویر لٹکی ہوتی تھیں 8 سو کمرے کے واحد ہوٹل میں مشکل سے پچیس سے پچاس مسافر ٹھہرے ہوتے تھے۔پی آئی اے کا عملہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرتا تھا۔ایک رات گزارنا ایک ہفتہ کے برابر ہوتی تھی، کیونکہ سڑکیں سنسان آدم نہ آدم زاد، پانچ بجے شام ورکروں کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو بسیں سڑک پر دکھائی دیتی تھیں۔ہوٹل کے باہر سائیکلوں کی اتنی لمبی قطار کہ دور دور تک سر ہی سر نظر آتے تھے اور پھر آناً فاناً مجمع کہاں غائب ہوتا تھا کہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ہوٹل کے کمروں میں کوئی تالہ بھی نہیں ہوتا تھا، ویٹروں سے ہاتھوں کے اشارے سے بات چیت ہوتی تھی۔ایک مرتبہ کھانے کے دوران واش روم معلوم کرنا تھا لڑکی ویٹر تھی پہلے میں نے انگلش میں واش روم پوچھا کیونکہ بہت زور سے پیشاب کی حاجت تھی وہ نہیں سمجھی مجبوراً ایسا اشارہ کیا کہ وہ ہنسنے لگی اور مجھے پیشاب خانہ بتلا کر آ گئی اور یہی اشارہ اُس نے اپنی چینی دوست کو سنایا۔اب میں جب بھی کھانا کھانے ھال میں جاتا تھا تو سب مجھے دیکھ کر ہنسنے لگتے تھے۔کینٹن میں ایک صحابی رسول حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا مزار بھی دیکھا۔اُس کی بھی تمام در و دیوار پر ماؤزے تنگ کی تصویر موجود تھی ،الغرض یہ دورہ ہر لحاظ سے کامیاب ترین دورہ تھا، اب تو ہر ماہ ہانگ کانگ کے دورے ہونے لگے کاروبار بڑھتا گیا سوچا کیوں نہ ہانگ کانگ سے آگے بڑھیں۔تائیوان اس کام کے لئے بڑا

پہلی سیلز کانفرنس 1970ء کی میزبانی کرتے ہوئے

اداکار محمود علی اور جیدی کے ساتھ گروپ فوٹو

آئیڈیل تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ ہماری حکومت تائیوان کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتی تھی ،مگر تائیوان کی حکومت بہت مستعد اور خالص کاروباری تھی۔اُس نے دنیا کے ہر ملک کے لئے ویزے کھول رکھے تھے علاوہ چائنا کہ کیونکہ اُنہیں چائنیز سے ڈر تھا کسی نہ کسی دن چائنا تائیوان پر اپنا حق جتاتے ہوئے قبضہ کرلے گا اس لئے چائنا کے لئے ویزے بند تھے اور پاکستان چونکہ چائنا کا بہترین دوست تھا اس لئے اُس نے تائیوان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔یہی قباحت تھی ھانگ کانگ میں بیشتر تائیوان کے لوگوں کے دفاتر تھے وہ ایسے لوگوں کا ویزہ اسپانسر کردیتے تھے جو اُن سے کاروبار کرنا چاہتے تھے لہذا ایک تائیوانی کمپنی سے رابطہ کیا اُس نے میرا ویزہ اسپانسر کیا تو تائیوان گیا اس لحاظ سے یہ تیسرا تجارتی ملک تھا یعنی پہلا چین پھر ہانگ کانگ اور اب میں تائیوان پہنچ گیا، یہاں چیزیں مہنگی ضرور تھیں مگر جاپان کی طرح پائیدار بھی تھیں اور بناوٹ میں نیاپن بھی تھا یعنی ھانگ کانگ کی نقل نہیں تھی۔یہ دورہ بھی کافی کامیاب رہا کیونکہ اب نئی نئی ورائٹی میں چیزیں بنوانا شروع کردیا، کچھ ہی دوروں کے بعد سوچا اب بہت ہوگیا آگے چلیں جس کا نام جاپان ہے سُنا تھا جاپان بہت مہنگا ملک ہے،ھوٹل،ٹیکسی تو تھی ہی مہنگی مگر کھانا تو بس اللہ کی پناہ۔ پاکستان سے دس دس گنا مہنگا، خیر سے اپنے ایک دوست کی معرفت جاپان پہنچے۔واقعی بہت خوبصورت ملک تھا،لوگ بھی اور سب سے زیادہ جو بات لگی وہ بے حد ملنسار تھے،آپ کسی کا پتہ پوچھیں تو کوشش یہ کرتے تھے کہ اگر نزدیک ہے تو پہنچا ہی آئیں۔البتہ زبان کی بہت مشکل تھی پانچ میں سے ایک جاپانی وہ بھی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کرتا تھا۔چند دن رُکے مگر کاروبار نہ ہوسکا،دوبارہ پھر جاپان آئے کافی کوشش کی کہ کسی طرح کاروبار ہو مگر جاپانی اپنے ایجنٹوں کے علاوہ کسی سے بھی کام نہیں کرتے ہر چیز بہت مہنگی تھی۔لہذا دوسرا دورہ بھی ناکام ھوا۔ اب مارچ 1969ء آگیا۔میری شادی کراچی میں 23 مارچ کو تھی اور میں 18 مارچ 1969ء تک ڈھاکہ میں مصروف تھا ایک دوست نے مذاق میں کہا کہ کیا شادی ملتوی ہوگئی ہے۔ بھاگم بھاگ کراچی پہنچے اور

تحریک استقلال کے جنرل سیکریٹری مشیر احمد پیش امام سالگرہ کا کیک کاٹ رہے ہیں

چاس مینڈوزا کے فیکٹری ورکر کے ساتھ پکنک 1972ء

اپنی شادی میں شرکت کی۔ایک امریکن کمپنی سے دعوت نامہ ملا کہ امریکہ آئیں اور بات چیت کریں کیونکہ اس دوران ہم نے ایک پاکستانی کمپنی چاس اے مینڈوز اخرید لی تھی جس کا مال امریکہ سے آتا تھا۔ یہ ادویات بھی امریکہ سے امپورٹ کرتی تھی۔اب جاپان میں چونکہ دعوت نامہ موصول ہوا تھا تو امریکہ کا ویزہ ہمارے پاس نہیں تھا۔سوچا امریکن ایمبیسی چلتے ہیں، ویزہ فارم بھرا تو امریکن کونسل نے ہمارے پاسپورٹ دیکھے اس میں دس چائنا کے ویزے لگے ہوئے تھے۔اُن دنوں چائنا اور امریکہ ایسے دشمن تھے جیسے سانپ اور نیولا۔امریکن کونسل نے پوچھا کہ تم چائنا کس لئے جاتے ہو میں نے بتایا ہم کو ایک تو ہانگ کانگ جانے کے لئے چائنا کا ٹرانزٹ ویزہ ضروری ہے تو دوسرا چائنا فیئر جو سال میں دو بار لگتا تھا۔اُس میں شرکت کے لئے جاتے تھے، اُس نے غصہ سے میرا پاسپورٹ واپس دیتے ہوئے کاؤنٹر سے نیچے جان بوجھ کر پھینک دیا۔مجھے بڑا غصہ آیا گو میری عمر صرف 25 سال تھی، مگر پاکستانی پاسپورٹ کی بے عزتی برداشت نہیں ہوسکتی تھی۔میں نے اُس امریکن کونسل سے کہا کہ میں تمہارے کونسل جنرل سے ملنا چاہتا ہوں۔اُس نے کہا کیوں میں نے جواب دیا تم نے میرے جھنڈے کی توہین کی ہے۔میرا پاسپورٹ زمین پر پھینکا ہے اُس پر ہمارا جھنڈا بنا ہوا ہے۔پہلے تو اُس نے بہت ٹالا پھر جب میں نے کہا کہ میں ایمبیسی کے دروازہ پر بیٹھا رہوں گا جب تک تمہارا کونسل جنرل مجھے نہیں بلاتا۔اُس نے اندر جا کر کونسل جنرل کو کچھ کہا تو اُس نے دوپہر تین بجے بلایا۔جبکہ اُس وقت دن کے صرف 10 بجے تھے۔ٹوکیو میں 5 گھنٹے اکیلے گزارنا بڑا مشکل کام تھا۔آس پاس کوئی ہوٹل ریسٹورنٹ بھی نہیں تھے۔خیر ٹیکسی پکڑی ہوٹل واپس آئے کھانا کھایا اُن دنوں میں اپنے ساتھ دس پندرہ ڈبے کھانے کے پیک کروا کر ساتھ رکھتا تھا۔کیونکہ اکثر ہوٹلوں میں حلال کھانا نہیں ملتا تھا۔ایک ڈبہ دو یا تین کھانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔بیکری سے ڈبل روٹی لے کر وقت گزارا، پھر ٹھیک تین بجے کونسل جنرل کے سامنے میں پہنچ گیا۔کوئی ساٹھ باسٹھ سال کا سرخ لمبا تگڑا گورا شخص تھا، اُس کے سامنے میں

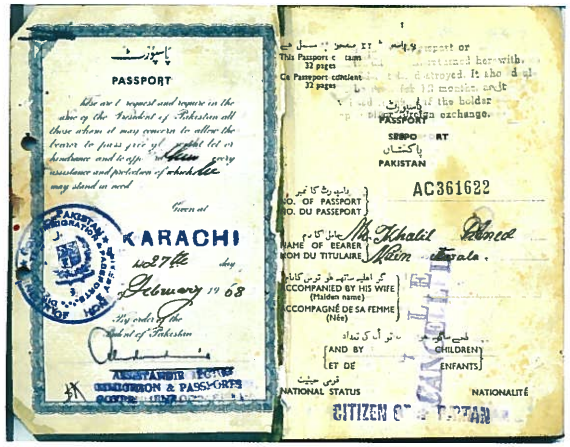

پہلا پاسپورٹ جو فروری 1967 میں جاری ہوا۔

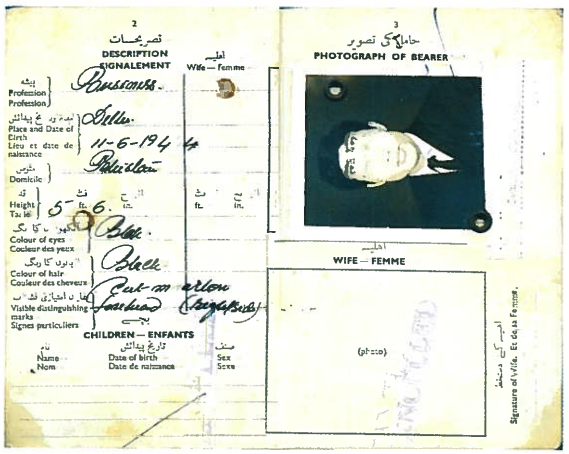

پہلا امریکن ویزہ جو ٹوکیو جاپان میں جنوری 1970 میں جاری ہوا۔

ایک اسٹوڈنٹ لگ رہا تھا۔ مجھ سے ہم کلام ہوا کہ میں کیا خدمت کرسکتا ہوں نوجوان؟ بڑی خوشگوار آواز تھی میں نے کہا سر میں آپ کے ملک سے تجارت کرنا چاہتا تھا، یہ خط مجھے کل امریکہ سے میرے ہوٹل کے ٹیلکس پر موصول ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ آپ سے ویزہ لے لوں چنانچہ ویزہ فارم بھرا آپ کے ویزہ کونسل کو دیا اُس نے پوچھا چائنا کیوں جاتے تھے میں نے وجہ بتادی مگر اُس نے میرا پاسپورٹ کاؤنٹر سے نیچے پھینک دیا اور کہا کہ ہم آپ کو ویزہ نہیں دیتے کیونکہ تم چائنا سے کاروبار کرتے ہو۔ میں نے کونسل جنرل سے کہا کہ بیشک وہ ویزہ نہ دیتا مگر اُس کو میرے جھنڈے کی توہین کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اُس نے پوچھا واقعی اُس نے تمہارے پاسپورٹ جان بوجھ کر پھینکا تھا میں نے کہا کہ کھڑکی کافی چوڑی تھی جب تک کوئی دھکا نہیں دے پاسپورٹ نیچے نہیں گرسکتا۔ اُس نے اُس کونسل کو بلوایا اور میرا واقعہ سنایا پہلے تو اس نے بہانہ بنایا مگر اُس سے کافی بحث کی پھر جانے کا حکم دیا اور میرا پاسپورٹ لے کر پڑھنا شروع کردیا۔ پھر اُس نے وہی سوال کیا کہ پاکستان سے چلتے وقت ویزہ کیوں نہیں لیا۔ مجھے ہنسی آگئی میں نے کہا جناب عالی میں نے ابھی تو بتایا کہ مجھے کل ہی یہ دعوت نامہ ہوٹل کے ٹیلکس کے ذریعہ امریکہ سے ملا تھا پہلے اس کمپنی نے کراچی بھیجا جہاں سے اُس کو بتلایا کہ میں جاپان میں ہوں۔ ٹوکیو کا پتہ دیا اُس کمپنی نے مجھ سے امریکہ سے فون پر بات کی میں نے کہا کہ دعوت نامہ بھیجو تاکہ میں یہاں ویزہ لے سکوں۔ آخر تم امریکہ سے کیوں تجارت کرنا چاہتے ہو۔ کونسل جنرل نے مجھ سے پوچھا۔ ہم تاجر ہیں جہاں مال سستا ہوگا ہم وہاں سے خریدیں گے۔ چونکہ امریکن کمپنی نے کم دام پر آفر کیا ہے لہٰذا ہم کوالٹی دیکھ کر آرڈر دیتے ہیں، کونسل جنرل مان گیا کہنے لگا ہم واقعی چائنا جانے والوں کو ویزہ نہیں دیتے مگر تمہاری بات میں صداقت ہے اور دوسرا میرے کونسل کی غلطی کا ازالہ بھی ضروری ہے لہٰذا میں صرف One Visit یعنی صرف ایک وزٹ ویزہ دوں گا آئندہ جب جانا ہو پاکستان سے ہی ویزہ لینا۔ میں نے خوشی سے قبول کیا ہاتھ ملایا اُس نے گھنٹی بجائی اور میرا پاسپورٹ ایک آفیسر کو دیا اور کہا

ملیر فارم کے افتتاح کے بعد گروپ فوٹو

1975ء میں چاس مینڈوزا آرام باغ کے دفتر کے افتتاح کے بعد مولانا احتشام الحق تھانوی

کہ اس پر ویزہ لگا دو چند منٹ بعد ہم کو پہلا امریکہ کا ویزہ مل گیا جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔
وہاں سے ہم نے امریکہ کا ٹکٹ خریدا، رات بھر خوشی سے نیند نہیں آ رہی تھی کہ ہم پندرہ گھنٹے کی پرواز کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ وہ ملک جس کا ہم نے صرف نام سُنا تھا کہ بہت بڑا ملک ہے بہت امیر ملک ہے ہر لحاظ سے تجارت صنعت و حرفت میں سب سے آگے مانا جاتا تھا مجھ جیسا نوجوان اب امریکہ تک پہنچ رہا تھا کیوں نہ خوشی ہوتی۔ امریکہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُن دنوں میں نے ایک کمپنی جس کا نام چاس اے مینڈوزا تھا وہ خریدی تھی۔ جس کا امپورٹ لائسنس کی کیٹگری پچیس ہزار روپے تھی۔ یعنی ہم سال میں دو مرتبہ پچیس ہزار روپے کی ادویات بیرون ممالک سے خرید سکتے تھے۔ جس کو امپورٹ کیا جاتا تھا۔ اس کمپنی کا امریکن کمپنی کریمر ار بن انٹرنیشنل کے ساتھ ایجنسی بھی تھی۔ جو کافی اہم ادویات بناتی تھی اُس امریکن کمپنی کے مالکان سے بھی ملنا تھا۔ لہذا امریکہ میں سب سے پہلے شہر ملوا کی (Milwaukee) پہنچے یہ سفر جاپان سے ہوائی شہر ہو کر شگاگو کے قریب شہر ہوتا تھا۔ جس کا نام ملوا کی تھا اتفاق سے ملوا کی کا موسم خراب تھا۔ لہذا جہاز شگاگو کے ائرپورٹ پر اترا وہاں سے میں نے اپنے میزبان دوست کو فون کیا غالباً نمبر غلط مل رہا تھا۔ وہاں سے آٹو میٹک مشین سے خاتون کی آواز میں جواب آیا کہ نمبر غلط ہے آپ صحیح نمبر ملائیں میں نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا پھر وہی جواب آیا۔ میں ناراض ہو گیا میں نے جواباً کہا کہ میں نے صحیح نمبر ڈائل کیا۔ مگر وہاں تو ریکارڈنگ مشین لگی ہوئی تھی۔ اُس نے تو وہی جواب دینا تھا۔ میں اُس ریکارڈنگ سے واقف نہیں تھا۔ کیونکہ ہمارے ملک میں ایسا ٹیلی فون میں کوئی سسٹم نہیں تھا۔ لہذا میں الجھ پڑا اور غصہ سے کہا کہ میں صحیح نمبر ملا رہا ہوں تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ پھر اُس نے وہی جواب دیا کہ آپ غلط نمبر ملا رہے ہیں تب میں سمجھا کہ یہ تو کوئی ریکارڈنگ ہو سکتی ہے۔ اپنی اس حماقت پر میں خود ہنسا اور شگاگو میں ایک رات ایرلائنز کے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا۔ کیونکہ مجھے تو ملوا کی جانا تھا۔ دوسرے دن صبح وہ ہوائی کمپنی کی گاڑی آ گئی، ایئر

غیر ملکی وفد کا گروپ فوٹو یسن ملک نمایاں ہیں

فرانس میں وی مین فلر کے ایکسپورٹ منیجر راجر بونے سی کے ساتھ فوٹو

پورٹ پہنچا کاؤنٹر پر اُس لڑکی کو فون کی بات بتائی اُس نے چیک کیا اور کہا کہ تم نے ایریا کوڈ نہیں ملایا تھا اس وجہ سے ٹیلی فون نہیں لگ سکا۔ شگا گو کیونکہ ملواکی سے باہر ہے۔ اس لئے پہلے ملواکی کا ایریا کوڈ ملاؤ پھر نمبر ملاؤ تب جا کر بات ہو سکے گی۔ چونانچہ اب نمبر ملایا تو میزبان سے بات ہوئی۔ وہ بھی پریشان تھے کیونکہ میرا پہلا سفر تھا انہیں یہ تو معلوم تھا کہ فلائٹ شگا گو اتر چکی ہے مگر میرا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔ میرے ٹیلفون نہ ہونے سے ساری رات وہ پریشان تھے۔ اب میرے اس رابطہ سے بہت خوش ہوئے نئی فلائٹ نمبر لئے اور کہا کہ ہم ملواکی ائرپورٹ پر ملیں گے۔ چالیس منٹ کی فلائٹ تھی جلد ہی ملواکی پہنچ گئے مگر یہاں درجہ حرارت منفی 15 تھا جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اور میرے پاس ایسے گرم کپڑے بھی نہیں تھے البتہ سوٹ گرم کپڑوں کا تھا سو جان بچ گئی۔ ہوٹل پہنچے مارکیٹ سے دستانے گرم موزے اور اوورکوٹ خریدا، وہ پہنا تو جان میں جان آ گئی۔ میٹنگ میں پہنچے ہم سب ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ کمپنی کے صدر سے میرا تعارف کروایا گیا وہ مجھ جیسے نوجوان کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ کاروباری بات چیت سے میں نے اُس کو اس بات پر راضی کر لیا کہ مال یعنی ادویات چھوٹی پیکنگ کے بجائے بلک یعنی ہزار ہزار کیپسول ٹیبلیٹس کی بڑی جار میں اور شربت گیلن پیکنگ میں بھیجا جائے۔ جس کی وجہ سے دام کافی کم ہو گئے اور یہاں سے پہلا کاروبار شروع ہوا ان بڑی پیکنگ کو ہم نے پاکستان میں چھوٹی پیکنگ یعنی 20 کیپسول کی شیشی میں پیک کر کے اُسی طرح مارکیٹ کر دی جس سے اضافی مال بھی امپورٹ ہوا اور منافع بھی زیادہ ہوا۔ دو سال میں ہم نے اتنا مال امپورٹ کیا جتنا دس سال میں پہلے والی مینڈوزا کی منیجمنٹ کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ ہمارا پس میں لین دین بڑھتا گیا۔

23 مارچ 1969ء ہمارے لئے ایک یادگار دن ثابت ہوا۔ ہماری شادی ہو گئی یہ دن اگرچہ پاکستان میں بھی ایک تاریخی دن مانا جاتا ہے۔ مگر ہمارے لئے دُوھرا تاریخی دن ثابت ہوا۔ شادی کے بعد اخراجات میں تو اضافہ ہونا تھا۔ اس لئے اور محنت شروع کی غیر ملکی دوروں میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں

نوجوانی کی ایک یادگار تصویر 1972ء

ملیر فارم کے افتتاح کے بعد محمد عبداللہ نینی تال والا اور جنید خلیل 1989ء

تک کہ شادی کے بعد پہلا طویل دورہ 1970ء میں ROUND THE WORLD تھا یہ افغانستان سے شروع کرنا تھا۔ کیونکہ اسی امریکن کمپنی نے ہم کو پاکستان کے ساتھ افغانستان اور ایران کا علاقہ بھی دے دیا۔ افغانستان میں کوشش کی کہ وہاں بھی اس کمپنی کا مال افغانستان میں بھی بیچا جائے۔ ایک طرف تو پورے پاکستان میں ہم اس کمپنی کا مال بیچ رہے تھے۔ اب اس کی مانگ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ہم پاکستانی کمپنیوں کی ڈسٹری بیوشن کا کام بھی کر رہے تھے بہت کمپنیاں تھیں۔ جن کا ڈسٹری بیوشن نیٹ ورک تھا۔ جس میں پاکستان فارماسیوٹیکل پروڈکٹس لمٹیڈ فائیزر، لیڈرلے، انفوردز، ووڈورڈز گرائپ واٹر کمپنیاں نمایاں تھیں۔ کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ان کمپنیوں میں سے ایک کمپنی نے اچانک بغیر کوئی وجہ بتائے ہماری ڈسٹر بیوشن کینسل کر دی۔ ہم نے کافی بحث کی ہم نے اُس کمپنی کے لئے بہت محنت کی تھی۔ اُس کمپنی مالکان کا پُرانا ریکارڈ یہی تھا۔ جب اُن کا مال چل جاتا تو اُس علاقے کے ڈسٹری بیوشن کو وہ تبدیل کر کے نئے ڈسٹری بیوٹر کے ساتھ نیا معاہدہ کر لیتے تھے۔ جس کا ہم نے ڈسٹری بیوشن لینے سے پہلے اُن مالکان کو آگاہ بھی کر دیا تھا۔ جس کا انہوں نے وعدہ کیا کہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ چونکہ وہ میرے واقف کار اور دوست بھی تھے۔ میں نے اُن کا اعتبار بھی کر لیا مگر افسوس کہ پھر وہی ہوا۔ جس کا مجھے خدشہ تھا۔ مال کافی بکنا شروع ہی ہوا تھا کہ ان کی نیت بدل گئی اور ایجنسی چھین لی۔ اب میں نے سوچا کہ اگر اسی طرح دوسری کمپنیوں کے لئے کام کرتے رہے تو اسی طرح ایجنسیاں آتی جاتی رہیں گی۔ ہم کیوں دوسروں کے لئے کام کریں اور یہ لوگ احسان مند بھی نہیں ہوتے۔ انہوں نے تو ہماری پانچ سال کی محنت کو صرف ایک منٹ میں ختم کر دی۔ یہ سراسر زیادتی اور احسان فراموشی کے مترادف ہے۔ اُسی دن میں نے اکیلے فیصلہ کیا کہ اب ہم کسی بھی کمپنی کی ایجنسی نہیں لیں گے۔ اور صرف اپنا ہی مال بنائیں گے اور مارکیٹ میں بیچیں گے۔ گو یہ فیصلہ کرنا بہت آسان تھا۔ مگر اس کو عملی جامہ پہنانا بہت مشکل تھا۔ میں نے اپنے بھائی، والد صاحب سب

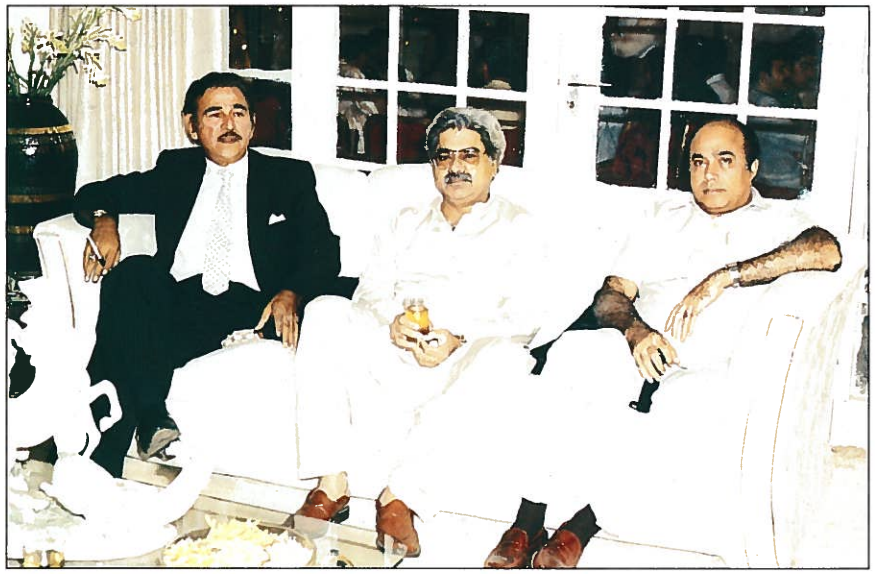

اداکار کمال، نفیس صدیقی کے ساتھ ایک تقریب میں

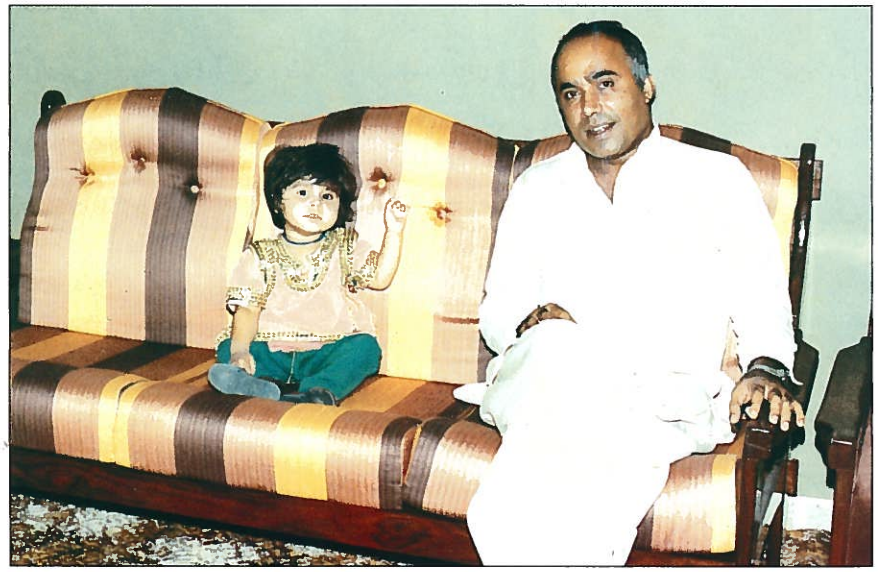

سب سے چھوٹی صاحبزادی صبوحی خلیل کے ساتھ فوٹو 1983ء

کواس فیصلہ سے آگاہ کیا۔

انہوں نے کہا کہ آپ ڈسٹری بیوشن کے ساتھ اپنا بھی مال تیار کریں تا کہ اخراجات نکلتے رہیں اگر خدانخواستہ ہمارا مال نہیں چلا تو ہم کو یہ ڈسٹری بیوشن واپس نہیں مل سکیں گی۔ میرے دماغ میں طارق بن زیاد کا کشتی جلا کر ہی مقابلہ کرنا دانش مندی تھی کا فلسفہ سما گیا۔ کیونکہ جب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ تو بندہ تن من دھن سے جنگ لڑے گا۔ یہی فلسفہ میرا بھی تھا۔ اللہ کا نام لے کر اپنی فیکٹری کی بنیاد رکھی۔ ادھر اللہ نے مدد کی امریکن کمپنی نے بھی اپنا مال بنانے کی اجازت دے دی۔ ایک بہت چھوٹی سی فیکٹری فیڈرل بی ایریا میں 400 گز کی بنی ہوئی عمارت میں شروع کی۔ فیکٹری میں مال بنانا شروع کیا۔ دوسری طرف بیرون ممالک کے دورے بھی ہوتے رہے۔ اللہ نے ہاتھ تھام لیا۔ دن رات محنت ہوتی رہی، صبح ساڑھے سات بجے فیکٹری جاتا اور رات گئے تک واپس آتا۔

مشرقی پاکستان کے حالات بھی دن بہ دن خراب ہوتے گئے۔ وہاں سے مال مغربی پاکستان ٹرانسفر کرنا شروع کیا۔ پھر مارچ 1971ء میں یحییٰ خان نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا، میں اس وقت ڈھاکہ میں تھا غالباً دوپہر کے تین بجے تھے میں پی آئی اے کے دفتر میں مال بُک کروا رہا تھا کہ شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے، چند ہی منٹوں میں ڈھاکہ کے تمام بازار بند ہوگئے۔ عوام سڑکوں پر نکل آئے، توڑ پھوڑ گھیراؤ جلاؤ شروع ہوگیا۔ اب تو بنگالی بہاریوں کے دشمن ہوگئے۔ بنگال یعنی مشرقی پاکستان میں ہر غیر بنگالی خواہ وہ پنجابی ہو پٹھان ہو یا مہاجر وہ سب کو بہاری کہتے تھے۔ اُن دنوں مشرقی پاکستان میں چونکہ عوامی لیگ نے 99 فیصد سیٹس جیتی تھیں۔ لہذا مجیب الرحمان اُن کے ہیرو تھے۔ وہ جو حکم دیتے بنگالی اُس پر عمل درآمد کرتے اب مغربی پاکستانیوں کا مشرقی پاکستان میں رہنا مشکل اور خطرناک ہو چکا تھا۔ لہذا پہلی ہی فلائٹ سے میں کراچی آ گیا۔ جب فوج نے مارچ 1971ء میں کریک ڈاؤن ایکشن کیا تو عوامی لیگی بھارت فرار ہوگئے اور ہندوؤں کی اکثریت جو اُن کے ساتھ تھی وہ بھی بھارت

پہلی کراچی سیلز کانفرنس ڈنر کے موقع پر 1970ء

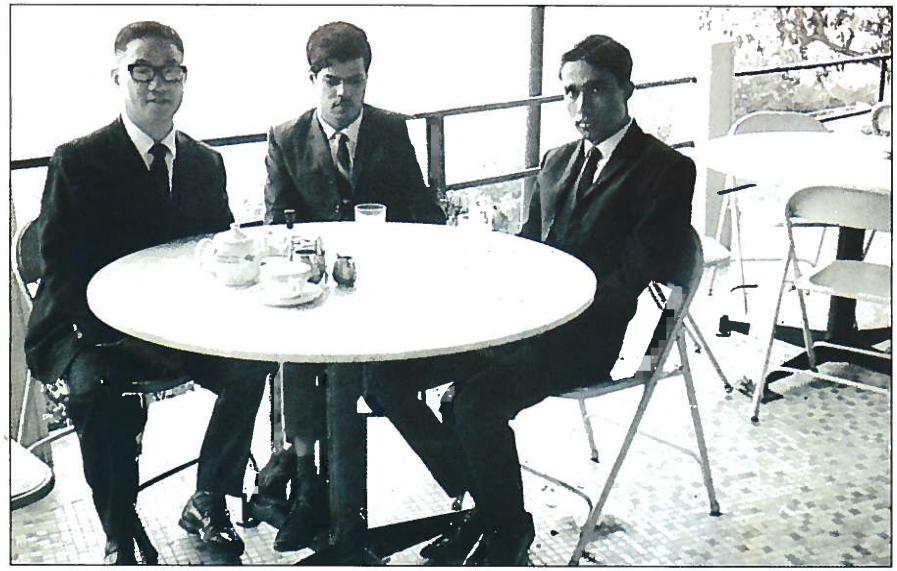

1967ء پہلا ہانگ کانگ میں ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے فوٹو

بھاگ گئی ۔مشرقی پاکستان میں جزوی امن ہوگیا۔شیخ مجیب الرحمان کوگرفتار کر کے کراچی میں نظر بند کیا گیا۔پھر میں ڈھاکہ اور چٹاگانگ گیا۔جتنا مال سمیٹ کر کراچی بھجوا سکتا تھا وہ بھجوایا وہاں سے واپسی پر پھر امریکہ گیا اُس امریکن کمپنی کے مالکان کو ان حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا۔اور اس بات کی اجازت طلب کی کہ اُن کا مال بھی پاکستان میں بنایا جائے۔اُس کے لئے فیکٹری تیار تھی۔مگر اُس امریکن کمپنی نے ان کا تیار کردہ مال بنانے کی اجازت نہیں دی۔البتہ بلک میں اُسی طرح بنا بنایا ہی خریدنا پڑتا تھا۔ اس دوران جو مال ہم نے جینرک نام سے اور اسپیشل ناموں(Special) سے تیار کر رہے تھے۔مارکیٹ میں اللہ کی مہربانی سے فروخت ہو رہا تھا۔اُس کے لئے میڈیکل ریپ کی ٹیم بھی کام کر رہی تھی۔فیکٹری میں صرف دس بارہ ملازم تھے۔جس سے ابتداء کی تھی البتہ مارکیٹنگ کے لئے 30,25 میڈیکل ریپ کام کر رہے تھے۔جو امریکن کمپنی کے آئٹم اور ہمارے تیار کردہ آئٹم فروخت کر رہے تھے ۔ڈاکٹر صاحبان نے بھی پاکستانی مال کو پسند کیا ۔اور اُس کے (Prescription) نسخہ نکالنے شروع کر دیئے۔بدقسمتی سے دسمبر 1971 میں پاک بھارت جنگ چھڑ گئی اور چند ہی دنوں میں ہمارے پیارے ملک کے دو ٹکڑے ہوگئے۔مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور مغربی پاکستان صرف پاکستان بن گیا۔ہمارا تمام مال جو چٹاگانگ اور ڈھاکہ میں رہ گیا تھا وہ وہیں رہ گیا اور یہ زندگی کا دوسرا بڑا نقصان تھا۔یعنی پہلے مارشل لاء کے وقت بلیک میں خریدا ہو مال رئٹیل پرائس پر بیچنا پڑا تھا اور اب یہ مال بنگلہ دیش بننے کی وجہ سے اُسی ملک میں رہ گیا اُس وقت ہمارا آدھا سرمایہ وہاں لگا ہوا تھا۔جس سے ہمیں ہاتھ دھونا پڑا۔یہ بھی بہت گہرا زخم تھا جس کا نقصان ہمیں سہنا پڑا۔مگر اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیا۔بلکہ اور ہمت پیدا کر دی کہ پھر سے محنت کریں تاکہ اس نقصان کا ازالہ ہو سکے۔ایک طرف ملک دو ٹکڑے ہوا تو دوسری طرف مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت بن گئی۔یحیٰی خان کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔جناب

نیشنل پیپلز پارٹی نواب شاہ کے جلسہ عام میں 1986ء

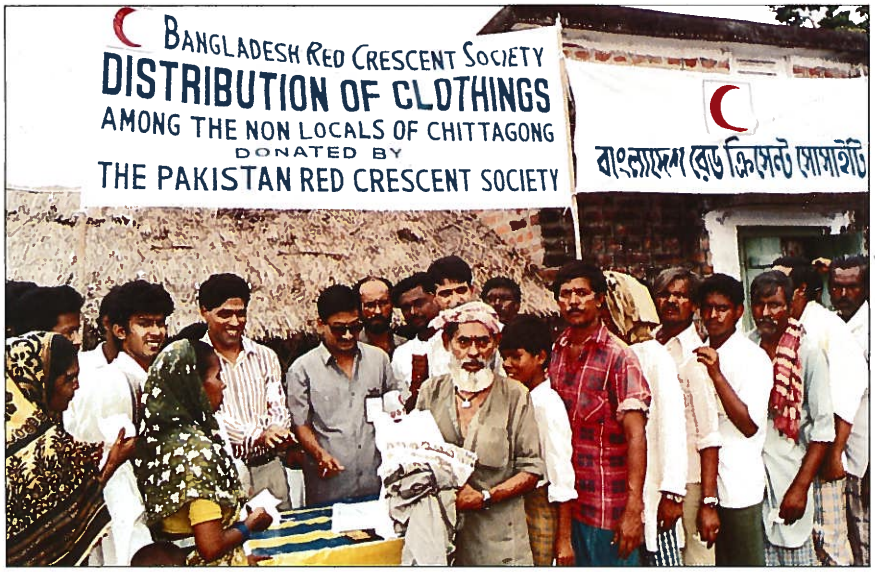

ڈھاکہ بنگلہ دیش میں محصورین کے کیمپ میں کپڑے تقسیم کرتے ہوئے فوٹو

ذوالفقار علی بھٹو ملک کے سربراہ بن گئے۔ پی پی پی کی حکومت آئی ورکروں کی موج ہوگئی، روٹی کپڑا مکان کا نعرہ کام کر گیا۔ ملک میں پہلی مرتبہ سوشلزم کا نعرہ عمل میں آ گیا۔ حکومت نے اندھا دھند صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ سرمایہ داروں میں بددلی پھیل گئی۔ تمام بنک انشورنس آئل ریفائنریز کاٹن ملز بھاری مشنری انڈسٹریز، شوگر ملز، جوٹ ملز ان میں شامل تھے۔

تمام اسکول کالج یونیورسٹیز تک نیشنلائز ہوگئے۔ ایک طرف خوشیاں بکھر گئی تو دوسری طرف ماتم ہی ماتم تھا۔ یہ حکومت کی بھیانک غلطیوں میں سے ایک تھی۔ مساجد کا کنٹرول بھی حکومت کے دائرہ کار میں آ گیا۔ بڑی بڑی مساجد اوقاف کے ایڈمنسٹریٹروں کی گرفت میں آ گئیں۔ اساتذہ علماء سرکاری ملازم بنا دیئے گئے۔ ہماری فیکٹری میں بھی یونین بن گئی۔ کام کم اور یونین بازی زیادہ ہوگئی پھر بھی ہماری فیکٹری چونکہ رہائشی علاقے میں تھی اس لئے محفوظ رہی دوسرا ہمارے ورکرز جن میں خواتین کی تعداد بہت زیادہ تھی، وہ یونین بازی میں ملوث نہیں ہونا چاہتی تھیں ۔ہمیں زیادہ فرق نہیں پڑا تھا بہرحال ورکرز کو زبان مل چکی تھی۔ انڈسٹریل ایریا بہت متاثر ہو رہا تھا۔ صنعت کار ملک چھوڑ کر جا رہے تھے افراتفری تھی۔ جس سے ملک کو بہت بڑا صنعتی نقصان پہنچا۔ آئندہ کی صنعت کاری ختم ہوگئی۔ صرف چھوٹی چھوٹی صنعتیں بچ گئیں تھیں۔ وہ بھی ورکروں کی غنڈہ گردی سے محفوظ نہیں تھیں ورکر جب چاہتے ہڑتال کرا دیتے مالکان کی بے عزتی اُن کے معمول کا حصہ بن گئیں۔ ہماری فیکٹری میں کام سکون سے چلتا رہا۔ ملکی دورے اور غیر ممالک میں آنا جانا لگا رہا۔ امریکن کمپنی نے چونکہ ایران اور افغانستان کا علاقہ بھی دیا ہوا تھا، سوچا اب افغانستان میں کام کیا جائے۔ لہذا افغانستان کا دورہ ضروری قرار پایا۔ شادی کو بھی چار سال ہو چکے تھے۔ اہلیہ کا ہنی مون بھی باقی تھا۔ سوچا کہ ایک تیر سے دو شکار کئے جائیں۔ اہلیہ کے ساتھ ایک ہفتے کا پروگرام طے پایا۔ اہلیہ کے ھنی مون کے نام پر افغانستان پہنچ گئے۔ وہاں ہمارا ڈسٹری بیوٹر کابل میں موجود تھا۔ اُس نے بڑی آؤ بھگت کی خوش قسمتی سے اُس کی دو بیگمات تھیں۔ جن

بحیثیت مشیر اطلاعات سندھ پرنس کریم آغا خان کا استقبال کرتے ہوئے 1994ء

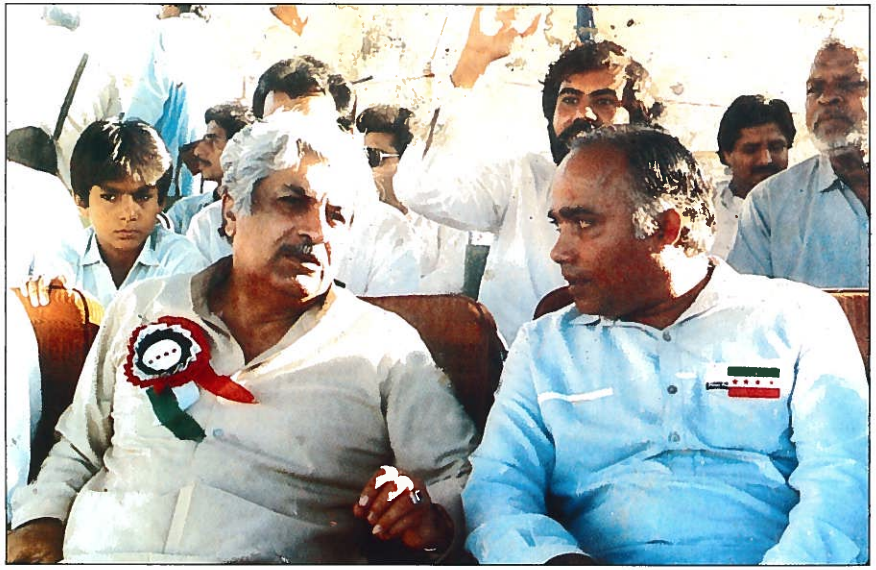

نیشنل پیپلز پارٹی کے چیئرمین غلام مصطفےٰ جتوئی کے ساتھ پہلے کنونشن 1985ء کے موقع پر

میں ایک کو بہت اچھی اُردو آتی تھی۔اُس کے والد پاکستان میں افغانستان کے سفیر رہے تھے۔اس وجہ سے وہ اُردو سیکھ گئی تھی۔وہ بہت کام آئی بیگم اُس سے گھل مل کر بہت خوش تھیں۔کابل، قندھار، غزنی، مزارشریف ،افغانستان کی کافی سیر کی۔اور پہلا آرڈر بھی بُک کیا۔گویا ہنی مون اور تجارت دونوں ہی کام ہوئے۔اُسی سال پی پی پی کی حکومت نے ڈرگ ایکٹ 1973 جینرک ایکٹ (Generic Act) کے نام سے نافذ کردیا۔تمام برانڈ کی دوائیں بند کردی گئیں اور جینرک نام یعنی عام نام سے ادویات مارکیٹ میں بیچنے کی اجازت دی گئی وہ پاکستانی دواسازوں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی اور بہت سی غیر ملکی کمپنیاں بند ہوگئیں۔ہماری کمپنی نے بھی اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اوردن رات جو مال بھی تیار ہوتا با آسانی بک جاتا۔

کرنسی کا اُتار چڑھاؤ:۔ جب پی پی پی کی حکومت آئی تو جہاں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں وہاں ڈالر اور برطانیہ کے پونڈ کی قیمت دُگنی کردی گئی۔یہ ہماری کرنسی کے ساتھ سب سے پہلا بھیانک مذاق کیا گیا۔ جس کے بعد مہنگائی نے گھر دیکھ لیا۔جو آج تک جاری ہے۔اُس زمانے میں ہمارا روپیہ اتنا مضبوط تھا کہ ڈالر پانچ روپے، پاؤنڈ نو روپے پچھتر پیسے (اُس زمانے میں ایک روپے میں سولہ آنے آتے تھے) جرمن مارک اور سوئیز فرینک ایک روپے میں ملتا تھا۔ھانگ کانگ ڈالر 60 پیسے میں بنکاک کا بھات صرف پچاس پیسے میں ملتا تھا۔فرانس کا سکہ فرینک فرینس بھی پچھتر پیسے میں ملتا تھا۔ایک ڈالر میں 500 جاپانی ین ملتے تھے۔یہ صرف اس لئے تھا کہ ہم نے کسی سے قرضہ نہیں لیا تھا۔اس وجہ سے ہمارا سکہ بہت مضبوط تھا۔اسی وجہ سے ہم دنیا کے تمام ممالک بغیر ویزے کے جاسکتے تھے۔صرف امریکہ کا پیشگی ویزہ لینا پڑتا تھا۔باقی تمام یورپ برطانیہ، جرمنی ،فرانس ،ڈنمارک ،کنیڈا، جاپان، ھانگ کانگ، بنکاک غرض چند ممالک کو چھوڑ کر کہیں بھی ویزا نہیں تھا۔اسی وجہ سے جب چاہتا دورے پر نکل جاتا۔کوئی بھی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ہم قرضوں پر قرضے لیتے گئے۔ہماری حکومت عیاشیوں پر

تحریک استقلال کراچی کے عہدیداران کے ساتھ

بحیثیت تحریک استقلال کراچی کے صدر اصغر خان کے ساتھ پریس کانفرنس کے موقع پر محمود شام نمایاں ہیں

اُتر آئی۔ پھر کیا تھا باہر کے ممالک میں ہماری کرنسی کی قدریں کم ہونا شروع ہوئیں اور انہوں نے ہم پر آنے جانے پر پابندی لگانا شروع کر دیں۔ ہر ہفتے کسی نئے ملک سے پیغام ملتا کہ اب آئیں تو ویزہ ایڈوانس لے کر آئیں۔ پھر ایک ایک کر کے صرف سری لنکا، مالدیپ کے علاوہ تمام ممالک میں ویزے ضروری ہو گئے۔ یہ تھا قرضے لینے کا انجام جو مہنگائی اور بے عزتی کی شکل میں سامنے آنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر ہماری حکومت نے قرضوں پر قرضے لئے۔ یہ سب کہاں خرچ کئے گئے کیونکہ ایک بھی بڑی بنیادی فیکٹری نہیں لگائی گئی۔ اُلٹا جو فیکٹریاں قائم تھی اُن کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ یہ بھی عجیب معاملہ تھا کہ پاکستانی مالکان کی ہی فیکٹریاں قومی ملکیت میں لی گئیں جبکہ دنیا میں غیر ملکی کمپنیاں قومی ملکیت میں لی جاتی ہیں۔ مگر اُلٹا معاملہ ہوا ایک بھی غیر ملکی کمپنی قومی تحویل میں نہیں لی گئی۔ جس سے صنعتی ترقی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُک گئی۔ اس کے برعکس ہمارے پڑوسی ملک بھارت نے جو ہمارے ہی ساتھ آزاد ہوا تھا۔ دن رات ایک سے ایک بڑھ کر بنیادی فیکٹریاں لگاتا رہا اور آج تمام معاملے میں خود کفیل ہو گیا اور ہمارے ملک میں تو ایک سوئی بھی نہیں بنائی جا سکتی۔ ہم ہر ضرورت کی اشیاء درآمد کر کے عوام کی ضرورتیں پوری کرتے گئے۔ البتہ صرف ایک اسٹیل ملز کراچی میں پورٹ قاسم میں روس کے تعاون سے لگایا گیا۔ تاکہ ہم کم از کم اسٹیل کے خام نگٹ بنا سکیں۔

1973ء میں نافذ العمل جینرک ایکٹ چونکہ ملٹی نیشنلز کمپنیوں کو پسند نہیں آیا تھا۔ جو ان کی اجارہ داری ختم کر رہا تھا۔ لہذا ان کمپنیوں کے مالکان نے اپنے اپنے سفارتی ذرائع سے وزیر اعظم بھٹو پر دباؤ ڈالوایا اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ پاکستانی ادویات ساز ادارے معیاری ادویات تیار نہیں کرتے اور اس کی آڑ میں سستی اور غیر معیاری ادویات تیار کر رہے ہیں۔ جو عوام کی صحت سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ اس جینرک ایکٹ کی وجہ سے ان غیر ملکی کمپنیوں سے تمام سرکاری نیم سرکاری ہسپتالوں سے ان کی ادویات بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھیں۔ غیر ملکی سفیروں کا دباؤ بڑھتا گیا۔ اور پھر

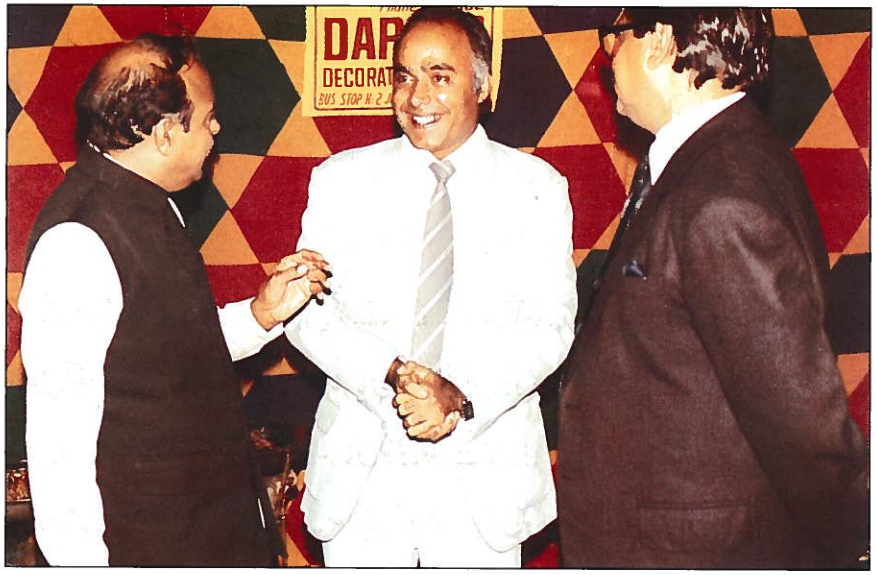

جناب الطاف گوہر اور عبید الرحمان ایڈوکیٹ کے ساتھ ایک تقریب کے موقع پر فوٹو

بحیثیت مشیر اطلاعات پہلی پریس کانفرنس کے موقع پر 1993ء

1975ء میں بھٹو صاحب نے اپنے ذاتی معالج ڈاکٹر نصیر شیخ کو وزارت صحت کا ڈائریکٹر جنرل نامزد کر دیا۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ جناب بھٹو صاحب ایوب خان کے آخری دور میں جب ان کو پنڈکس کا آپریشن کرانا پڑا تھا تو ان ہی سرجن صاحب نے مفت آپریشن کیا۔ اور اُس وقت کی حکومت کا غالباً دباؤ تھا کہ اس آپریشن کو کامیاب نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اور آپریشن ہی کے دوران جناب بھٹو صاحب کو نقصان پہنچانا مقصود تھا۔ مگر سرجن نصیر شیخ نے ان کا کامیاب آپریشن کر کے اُن کی جان بچائی۔ اُس احسان کے بدلے انہیں وزارت صحت میں ڈائریکٹر جنرل کا بہت بڑا عہدہ دیا گیا۔ باوجود اس حقیقت کے انہیں ادویات سازی کی الف، ب بھی نہیں معلوم تھی۔ البتہ وہ غیر ملکی کمپنیوں کے سپورٹر سمجھے جاتے تھے۔ خود اُن کے بھائی منیر شیخ ایک امریکن ادویات بنانے والی کمپنی میں مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔ سرجن نصیر شیخ صاحب نے آتے ہی چند ماہ میں 1973ء کا جینرک ایکٹ منسوخ کروادیا اور پھر راتوں رات ڈرگ ایکٹ 1976ء نافذ کر کے تمام صوبائی صحت کے پاور مرکزی حکومت کو ٹرانسفر کر دیئے اس سے قبل ڈرگ ایکٹ کے تحت صوبائی وزارت صحت لائسنس جاری کرتی تھیں جس کی معمولی فیس ہوا کرتی تھی۔ اُس لائسنس کے تحت تمام ادویات بنائی جاسکتی تھیں۔ مگر ڈرگ ایکٹ 1976ء کے تحت بھاری لائسنس فیس دس ہزار روپے اور فی ادویات 5000 روپے مقرر کی گئی جو ایک تاریخی اقدام تھا جس کا مقصد ایک مرتبہ پھر ملکی ادویات ساز اداروں کو پیچھے کر کے نقصان پہنچانا مقصود تھا اور ان غیر ملکی کمپنیوں کی برانڈڈ ادویات کو دوبارہ مارکیٹ دلوانا تھا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ایک انوکھی اسکیم نافذ کی گئی کہ تمام دواساز ادارے اپنے آپ کو دوبارہ رجسٹریشن کیلئے مرکزی وزارت صحت کو درخواستیں دیں گے۔ اس کے لئے نئی فیس کے چالان کے ذریعے ان کی از سر نو رجسٹریشن ہوگی۔ جو مرکزی وزارت صحت کے ڈرگ افسران ہی فیکٹریوں کی جانچ پڑتال کر کے نئے لائسنس کا اجراء کریں گے۔ اس ڈرگ ایکٹ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تمام پاور مرکزی ڈرگ انسپکٹرز اور

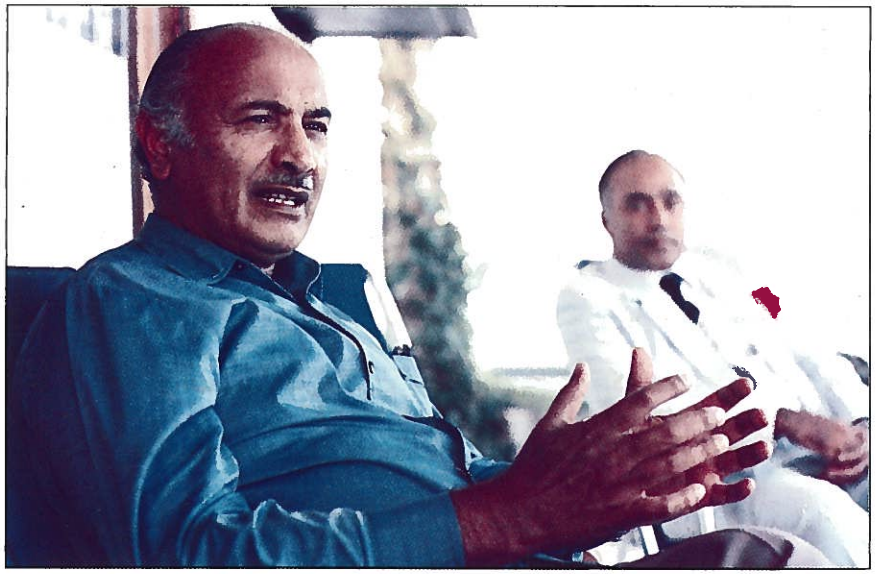

ائر مارشل اصغر خان کے ساتھ فوٹو 1984ء

حیدر آباد کے دورے کے موقع پر 1983ء

ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کے پاس رہے گی ۔وہ جس کو چاہے گا لائسنس دے گا ۔اور جس کو چاہے گا اپنی صوابدید پر لائسنس دینے سے انکار کر سکے گا ۔اُس کی کوئی شنوائی بھی ممکن نہیں ہو سکے گی ۔صرف سیکرٹری صحت برائے نام اس پاور کو استعمال کر سکے گا ۔حتٰی کہ وزیر صحت کے پاس کسی بھی قسم کی کوئی اتھارٹی نہیں ہوگی ۔ وہ صرف نام کا وزیر صحت ہوگا ۔اس اقدام سے دواساز اداروں میں غیر یقینی صورت پھیل گئی ۔اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس ڈرگ ایکٹ 1976ء کے تحت اگر کسی دواساز ادارے کو 30 ستمبر 1976ء تک مرکزی وزارت صحت نے نیا لائسنس جاری نہیں کیا تو پہلی اکتوبر 1976ء کو وہ دواساز ادارہ کا پرانا لائسنس خود بخود ختم ہو جائے گا ۔وہ نہ کوئی ادویات بنا سکے گا ۔اور نہ ہی کوئی ادویات فروخت کر سکے گا ۔ یہ ایک بہت ہی بڑا دھما کہ تھا جس کی آڑ میں کرپشن کے نئے راستے کھولنا مقصود تھا ۔اور یہ تمام راستے ڈرگ انسپکٹر صاحبان کے توسط سے ڈائریکٹر جنرل کی صوابدید پر منحصر تھے ۔اگر کسی ڈرگ کنٹرولر صاحبان نے کسی دواساز ادارے کی سفارش بھی کی تو ڈائریکٹر جنرل کو اختیار تھا کہ وہ اس سفارش کو مسترد کر سکتا تھا ۔اسی طرح اگر جب یہ کمیٹی کسی دواساز ادارے کا لائسنس مسترد کرنے کی سفارش کرے تو ڈائریکٹر جنرل کو یہ خصوصی اختیار تھا کہ وہ اس کی سفارش نہ مانے اور اپنی مرضی سے لائسنس جاری کر سکتا تھا ۔جس کا بعد کے حالات میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھنے میں بھی آئی ۔ایک بہت چھوٹی فیکٹری جو صرف 300 گز پر رہائشی علاقہ میں بنی ہوئی تھی ،اُس کا راتوں رات انسپکشن کروایا گیا جس کو ادویات سازی کیلئے ناموزوں قرار دیا گیا ۔

مگر ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کے حکم سے اُسی گمنام فیکٹری کو لائسنس جاری کر دیا گیا ۔اسی طرح ایک بہت بڑی پرانی فیکٹری جس کو انسپکشن ٹیم نے لائسنس جاری کرنے کی سفارش کی تھی ،اُس کو لائسنس جاری نہیں کیا گیا ۔اس میں پہلی گمنام فیکٹری کے مالکان کا ڈائریکٹر جنرل صاحب کے کسی قریبی عزیز کا حصہ دار بتایا گیا تھا اور جس کا لائسنس نہیں جاری کیا گیا ،اُس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ فیکٹری مالکان نے سرجن

1967ء ہانگ کانگ میں کھینچی گئی پہلی رنگین تصویر

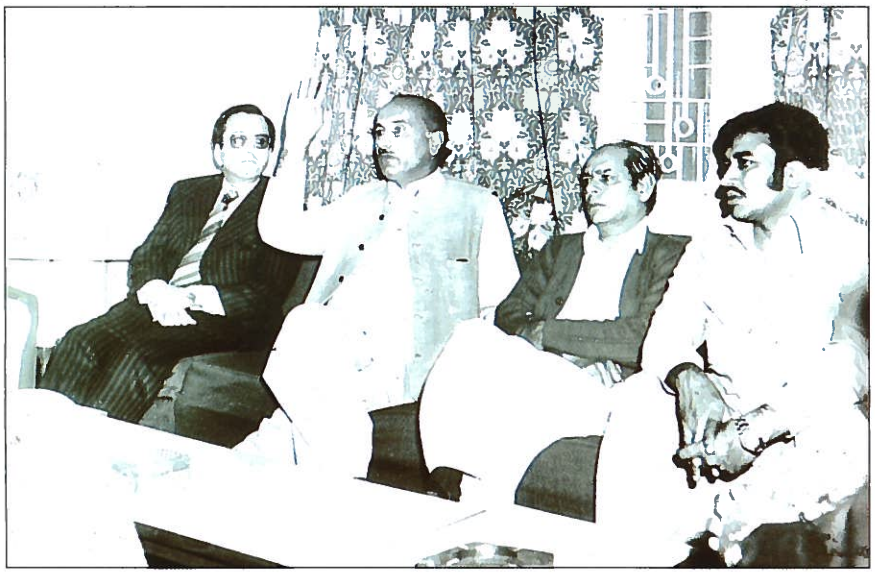

تحریک استقلال میں شمولیت کے موقع پر 1977ء

نصیر شیخ صاحب کے ہسپتال میں ادھار مال سپلائی کرنے سے اُس زمانے میں انکار کر دیا گیا تھا۔ جب وہ ڈائریکٹر نہیں تھے اور اُن کا حساب کتاب لین دین بھی وقت پر نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال ایسی کئی مثالیں مارکیٹ میں آتی رہیں۔ ایک میٹنگ ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ صاحب نے ملکی دواساز اداروں کے مالکان سے کی اور اُن کو یقین دلایا کہ ان ملکی اداروں کو اُن کا جائز حصہ دلائیں گے۔ کیونکہ ملکی دواساز اداروں کی ادویات غیر ملکی دواساز اداروں کے مقابلے میں بہت سستی ہیں اور قائدعوام جناب بھٹو صاحب کا فرمان ہے کہ عوام کو سستی دوائیں ملنی چاہئے۔ مگر اس کے برعکس جب سرجن صاحب نے غیر ملکی دواساز اداروں کے مالکان سے ملاقات کی تو انہیں دھمکایا کہ وہ بہت مہنگی دوائیں فروخت کر کے کروڑوں روپے کمار ہے ہیں اور غریب عوام کو لوٹ رہے ہیں۔ اُن کے اداروں کو لائسنس نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی حکومت ان اداروں کی سرپرستی کرے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ غیر ملکی دواساز اداروں نے اُن سے الگ الگ ذاتی ملاقاتیں کیں اور یہی بات سُنی گئی کہ اندرون خانہ لین دین طے ہوا اور پھر صرف غیر ملکی کمپنیوں کو لائسنس کا اجراء ہونا شروع ہوا جو لاکھوں روپے کے عوض ایسا ممکن ہوسکا، جبکہ ملکی دواساز ادارے اتنی بڑی رقموں کا بندوبست نہیں کر سکے جو اُس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تصور ہوتی تھی اور اتنی بڑی رشوت کی کوئی مثال بھی نہیں سُنی گئی تھی یوں ملکی ادارے نئے لائسنس کے حصول میں پیچھے رہ گئے۔ بدقسمتی سے اُس زمانے میں میری فیکٹری میں ایک حادثہ پیش آیا۔ فیکٹری میں کچھ لڑکیوں کی غفلت سے آگ لگ گئی۔ جس میں کچھ لڑکے اور لڑکیاں جھلس گئے آگ بجھادی گئی پولیس اور انتظامیہ کو اطلاع دے دی گئی۔ جو محض ایک حادثہ تھا اس میں ایک لڑکے کی بعد میں موت بھی واقع ہوگئی۔ ہماری انتظامیہ نے متاثر ہونے والے افراد جن میں اکثریت لڑکیوں کی تھی عباسی شہید اسپتال میں پرائیوٹ وارڈ میں ذاتی خرچ پر علاج کروایا۔ اس حادثے کی خبر ایک بڑے اخبار کے رپورٹر کو بھی مل گئی۔ جس نے آکر مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی کہ اگر اُس کو اس کی طلب کردہ رقم نہیں دی گئی تو

تحریک استقلال کے چیئرمین اصغر خان، چیئرمین سندھ خان محمد جمال کے ساتھ

وہ اخبار میں اس کو اچھالے گا۔ میری شروع سے عادت ہے کہ میں کبھی کسی کی بلیک میلنگ میں نہیں آتا اور پھر میں تو اُن کا علاج بھی پرائیویٹ وارڈ میں کروا رہا تھا۔ غالباً اُس اخباری نمائندے کو معلوم تھا کہ عباسی ہسپتال میڈیکولیگل نہیں تھا۔ جس میں سرکاری طور پر علاج نہیں ہوسکتا تھا۔ جبکہ سول ہسپتال اور جناح ہسپتال ہی ان کے علاج کرنے کے مجاز تھے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی، بہرحال اس اخباری رپورٹر نے ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈز میں گھس کر زبردستی ان لڑکیوں کی تصاویر لینے کی کوشش کی۔ لڑکیوں کے والدین نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی لڑکیوں کی بے پردگی ہو جس کی انہوں نے مزاحمت کی جس سے یہ فوٹوگرافر میرے کارکنوں سے لڑ بیٹھے جس کا دوسرے دن اُس اخبار میں نمک مرچ لگا کر اسٹوری شائع کی گئی جس کی بھنک ہمارے ان ڈائریکٹر جنرل صاحب کو بھی ہوگئی۔ اُنہوں نے فوراً اسلام آباد سے اپنے پسند کے افراد کو انکوائری کے لئے کراچی بھیجا۔ حادثہ چونکہ بجلی کی شاٹ سرکٹ کی وجہ سے ہوا تھا اور پولیس اور آگ بجھانے کے محکمہ نے بھی اس کو قدرتی حادثہ قرار دیا تھا۔ مگر سرجن صاحب نے اس کی آڑ میں پاکستانی دواساز اداروں کو دھمکانے کیلئے میری فیکٹری کا لائسنس بغیر شوکاز نوٹس منسوخ کر دیا۔ میری فیکٹری کے ورکر معہ یونین کے عہدیداروں اور زخمی ہونے والے ورکروں کے لواحقین نے اُس زمانے کے وزیر صحت خان محمد جمالی صاحب سے ملاقات کی جو وزیر لیبر بھی ہوتے تھے۔ انہوں نے اس واقعے کی تحقیقات اپنے محکمے سے کروائی تو حقیقت سامنے آئی کہ یہ ایک حادثہ ہے۔ انہوں نے بغیر ڈائریکٹر جنرل صحت سے پوچھے معطل لائسنس کو اپنے حکم سے بحال کر دیا۔ اُن کو بھی علم نہیں تھا کہ اس نئے ڈرگ ایکٹ 1976ء میں وزیر صحت اس بات کے مجاز نہیں ہوتے کہ وہ کسی کا لائسنس بحال کر سکیں اس بات کا ڈائریکٹر جنرل صاحب جو اُن کے ماتحتی میں تو آتے تھے مگر قانون کی نگاہ میں صرف وہی مجاز تھے، جو لائسنس کو معطل یا بحال کر سکتے تھے، اس موقع پر انہوں نے مجھے اسلام آباد وزارت صحت کے دفتر میں طلب کر کے کہا کہ وہ وزیر صحت کے اس حکم کو نہیں مانتے۔ لہذا فیکٹری

تحریک استقلال کے عشائیہ میں پروفیسر غفور احمد نفیس صدیقی عبدالستار افغانی نمایاں ہیں

کورنگی ایسوسی ایشن کے دورے کے موقع پر وزیر اعلیٰ عبداللہ شاہ کے ساتھ۔

کالائسنس معطل ہی رہے گا۔ یہ بات میں نے کراچی آ کر وزیر صحت جمالی صاحب کو بتائی۔ انہوں نے مجھے لکھ کر حکم دیا کہ فیکٹری بند کرنے سے مزدوروں کا نقصان ہوگا اور وہ غریب بے روزگار ہو جائیں گے۔ لہذا فیکٹری کھول دی جائے اور قانون کے مطابق مرنے والے مزدور اور زخمی مزدوروں کو کمپنی اپنی جیب سے معاوضہ ادا کرے جو میں نے اُن ہی کے ہاتھوں چیک دلوائے اور فیکٹری کھول دی۔ اب وزیر صحت اور ڈائریکٹر جنرل صحت کی آپس میں ٹھن گئی۔ وزیر صحت میرے موقف کی حمایت کر رہے تھے جبکہ ڈائریکٹر جنرل میری سخت ترین مخالفت کر رہے تھے۔ اسی کشمکش میں 30 ستمبر 1976ء آ گیا اور مجھے وزارت صحت نے نیا لائسنس جاری نہیں کیا۔ گویا پہلی اکتوبر 1976ء سے میری فیکٹری خود بخود بند ہو جانی تھی۔ گو کہ یہ بہت بڑا نقصان تھا مگر میں نے قانون کا احترام کرتے ہوئے یونین اور ورکرز کو کہا کہ کل سے فیکٹری تا حکم ثانی بند رہے گی اور تمام مشینوں کی صفائی کر کے اُن پر پلاسٹک چڑھا کر فیکٹری بند کر دی جائے۔ فیکٹری کی 6 بجے چھٹی کر دی گئی۔ البتہ صفائی اور مینٹینس والے افراد رُک کر صفائی میں لگ گئے مجھے کیا پتہ تھا کہ ڈائریکٹر جنرل صاحب ایسا گھناؤنا بدلہ لیں گے۔ انہوں نے رات دس بجے پولیس اور ڈرگ انسپکٹر صاحبان کی موجودگی میں میری فیکٹری جہاں صرف مشینوں میں تیل ڈالا جا رہا تھا اور فیکٹری میں فرش پر پوچھا لگ رہا تھا اور ابھی بارہ بجنے میں دو گھنٹے بھی باقی تھے۔ زبردستی فیکٹری میں گھس کر چھاپا مارا اور چھاپے کا وقت بارہ بجکر پندرہ منٹ لکھ کر FIR کٹوا دی۔ حالانکہ وہاں کوئی مال نہیں بن رہا تھا۔ فیکٹری میں رکھے ہوئے ڈبے کھلوائے اُن کے سمپل لئے، جو ورکرز صفائی کر رہے تھے ان میں ایک بھی ادویات بنانے والا افسر موجود نہیں تھا۔ اُن غیر پڑھے لکھے لوگوں سے زبردستی لکھوایا کہ وہ مالک کے حکم سے بارہ بجے کے بعد مال بنا رہے تھے انہوں نے دھمکی دی اگر ان کاغذات پر دستخط نہیں کئے تو انہیں گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا جائے گا۔ ورکرز ڈر گئے انہوں نے اُن کاغذات پر دستخط کر دیئے اس طرح وزارت صحت کے افسران کا یہ کارنامہ دوسرے دن تمام

بی ایچ وائی ہسپتال کے دورے کے موقع پر عبدالحائق اللہ والے نمایاں ہیں

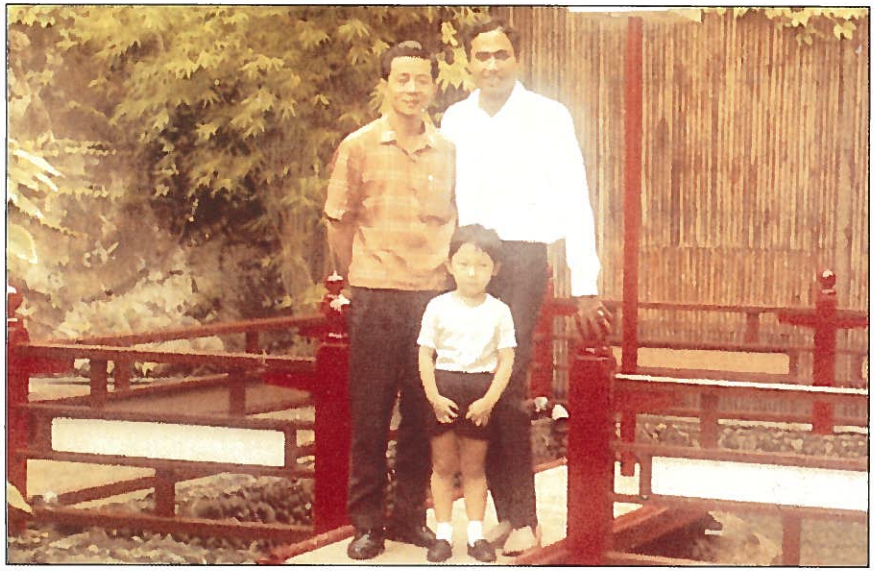

1968ء ہانگ کانگ کے باغ میں ایک دوست کے ساتھ

اخبارات کی زینت بنا اور میرے خلاف FIR کاٹ دی گئی اور میری گرفتاری کے لئے پولیس نے چھاپے مارنے شروع کر دیئے اُن دنوں میں نے پولٹری فارم نیا نیا ملیر میں بنوایا تھا اور میری رہائش بھی وہیں تھی جو اتفاق سے کسی کو بھی نہیں معلوم تھا البتہ میرے گھر والوں کو تو معلوم تھا وہ صبح صبح میرے فارم پر آئے اور بتایا کہ رات پولیس اور ڈرگ انسپکٹروں نے زبردستی اُن سے میرے خلاف بیان پر دستخط کروائے ہیں۔اور پولیس نے پرانے گھر پر چھاپے بھی ڈالے مگر چونکہ میں اُس گھر میں نہیں تھا لہذا اب وہ میرے دفتر میں ضرور آئیں گے۔اس کے لئے مجھے ضمانت قبل از گرفتاری لینی پڑے گی۔یہ اس نئے ایکٹ میں شامل کی گئی تھی تاکہ مالکان کو پریشان کیا جاسکے۔وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔میں اپنے وکیل کے ساتھ ہائی کورٹ پہنچا تاکہ ضمانت قبل از گرفتاری (BAIL BEFORE ARREST) لے سکوں۔ پولیس نے ہائی کورٹ میں اپنے بندے سادے کپڑوں میں کھڑے کئے ہوئے تھے اور یہ سب کچھ اُنہیں موصوف ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کی مہربانی تھی جو مجھے گرفتار کروا کر پاکستانی دواساز اداروں کو بھی اپنی گرفت میں لانا چاہتے تھے۔خوش قسمتی سے یہ پولیس اہل کار مجھے نہیں پہنچانتے تھے۔میں پچھلے دروازے سے عدالت میں پہنچا۔ڈرگ ایکٹ میں تمام کیس صرف ڈرگ کورٹ میں چل سکتے تھے۔لہذا سب سے پہلا کیس میرا رجسٹر ہوا۔میرے وکیل نے بتایا کہ وزارت صحت نے یہ صرف ڈرامہ رچایا ہے۔فیکٹری بند تھی۔ایف آئی آر کا ٹائم غلط لکھا گیا۔دس بجے رات کے بجائے ½ 12 لکھا گیا ہے۔جبکہ تھانے سے روانگی ½ 9 دکھائی گئی ہے جو پولیس روزنامچے میں موجود ہے اور تھانہ فیکٹری سے صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔بھلا ایک کلومیٹر کا فاصلہ رات ½ 9 کس طرح تین گھنٹوں میں طے ہوا اور پھر ایک بھی دوا بنانے والا افسر بی فارماسسٹ کیوں موجود نہیں تھا جبکہ صفائی کرنے والا جس کو پولیس نے پیش کیا۔اُس نے بھی یہی کہا کہ وہ فرش صاف کر رہا تھا کہ پولیس فیکٹری میں داخل ہوئی۔اُس سے زبردستی انگوٹھا لگوایا گیا۔کیس چونکہ بہت کمزور

مشیر احمد پیش امام کے ساتھ ایک سیاسی تقریب میں 1982ء

ترکی کے دوست محی الدین ڈولو کے ساتھ

تھالہذا جسٹس زیڈاے چناء جو بہت سخت اور سمجھ دار جسٹسوں میں شمار ہوتے تھے انہوں نے صرف ایک بات وکیل صفائی سے پوچھا کہ جب رات بارہ بجے تک اجازت تھی تو ½ 9 بجے روزنامچہ کے مطابق ڈرگ انسپکٹر اور پولیس قبل از وقت کیوں کسی کو پیشگی پریشان کرنا چاہتی تھی۔ پھر ایک آدھ گھنٹے میں کونسی قیامت آجاتی۔ اگر یہی چھاپا دوسرے دن مارا جاتا پھر تو کہا جاسکتا تھا کہ مالکان بغیر لائسنس مال بنانا چاہتے ہونگے پھر ایک بھی پیکنگ گرلز کا موجود نہ ہونا نہ ہی کسی فارماسسٹ کے بغیر ادویات بن سکتیں یہ سب جھوٹا کیس ہے اور Harrasment کے سوا کچھ بھی نہیں ہے لہذا انہوں نے میری ضمانت قبل از گرفتاری منظور کرلی بلکہ استغاثہ کو وارننگ بھی دی کہ وہ قانون کے ساتھ کھیل نہ کرے بصورت دیگر ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کے خلاف کاروائی کی جائے گی۔ اللہ کے فضل سے مجھے ضمانت قبل از گرفتاری تو مل گئی مگر فیکٹری کو لائسنس نہیں مل سکا جو میری زندگی کا تیسرا بڑا حادثہ تھا۔ کورٹ کے اس فیصلے کے بعد ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ میرے سخت ترین دشمن بن گئے۔ انہوں نے تمام ڈرگ انسپکٹرز صاحبان کو حکم دیا کہ مارکیٹ سے میری کمپنی کی بنی ہوئی ادویات کے سیمپل اُٹھائیں اور ڈرگ لیبارٹریز میں ٹیسٹ کروائیں تاکہ مجھے زیادہ سے زیادہ پریشان کیا جاسکے۔ پھر کیا تھا ایک دن میں دس دس سیمپل اٹھائے گئے اور ان میں سے زیادہ تر فیل کردیئے گئے۔ تاکہ میرے خلاف زیادہ سے زیادہ کیس بنائے جاسکیں۔ ادھر میری طرح دوسرے پاکستانی اداروں کے لائسنس بھی بحال نہیں ہوئے تھے۔ ہزاروں مزدور جن میں لڑکیاں زیادہ تھیں بے روزگار ہوگئیں۔ انہوں نے وزارت صحت کے کراچی دفتر کا گھیراؤ کرلیا۔ میری فیکٹری کے ورکرز اور یونین کے افراد نمایاں تھے۔ انہوں نے ڈائریکٹر جنرل اور وزارت صحت کے افسران کے خلاف نعرہ بازی کی پولیس کو بلایا گیا۔ پولیس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنی تحویل میں لے کر دفتر سے نکالا اور میرے خلاف پرچہ کٹوادیا حالانکہ اُس میں صرف چند ورکرز تھے۔ مالکان نہیں تھے۔ مجھے پھر ضمانت قبل از گرفتاری لینی پڑی۔ پھر ڈرگ ایکٹ کے خلاف مقدمہ درج تھا۔ جسٹس زیڈاے چناء

اخباری نمائندوں کے ساتھ 1984ء

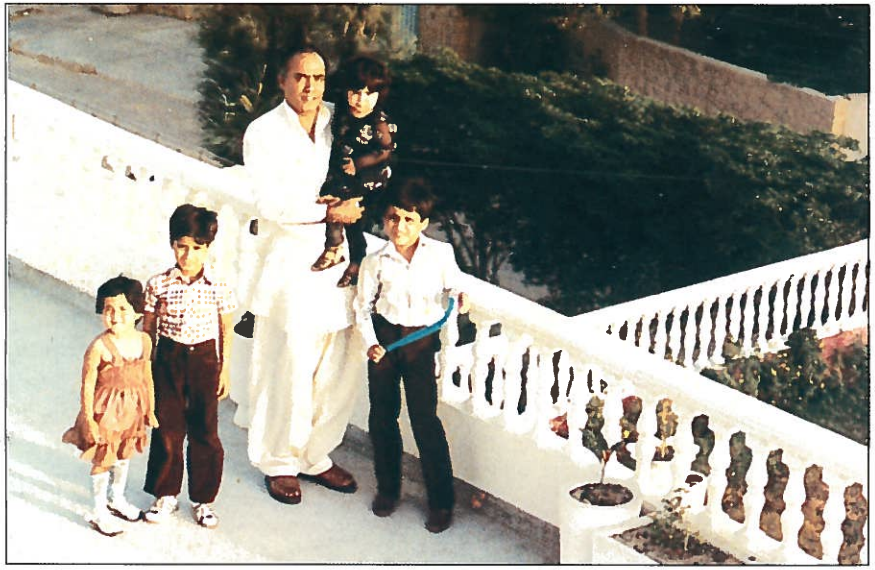

1982ء نینی تال ولا کا فوٹو خرم خلیل جنید خلیل صبوحی خلیل (گود میں) سبین عبداللہ کے ساتھ

مرحوم کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا پھر مجھے ضمانت قبل از گرفتاری مل گئی۔اس دوران میرے خلاف اسی ڈرگ کورٹ میں ادویات کے سیمپل فیل کر کے مقدمات کی بھر مار کردی گئی۔جسٹس چناء صاحب نے وکیل استغاثہ کو بہت لتاڑا کہ کیا صرف ایک خلیل احمد نینی تال والا اور اُس کی کمپنی چاس۔اے۔مینڈوزا ہی رہ گئی ہے جو ڈرگ ایکٹ کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔انہوں نے صاف کہا یہ زبردستی پریشان کرنے کے ہتھکنڈے ہیں۔اس کے سوا کچھ بھی نہیں لہذا انہوں نے تمام کیس خارج کر دیئے۔اس بات کا ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کو پتہ چلا تو ذاتیات پر اُتر آیا۔اُس نے میرے خلاف D.P.R کا مقدمہ درج کرادیا۔تاکہ اب ڈرگ کورٹ کے بجائے ڈیفنس آف پاکستان رولز جو بھٹو صاحب نے اپنے مخصوص دشمنوں کے لئے اسپیشل کورٹ کے ذریعہ سیاسی انتقام لینے کے لئے بنایا تھا مجھ جیسے غیر سیاسی شخص پر لاگو کردیا گیا۔یہ سب سرجن صاحب کی شرارت تھی۔وہ اب میرے ساتھ ذاتی دشمنی پر اُتر آئے تھے۔انہوں نے مجھے سزا دلوانا تھی۔ایک طرف تو میری فیکٹری بند تھی جو ایک بہت بڑی پریشانی تھی۔جو مجھ پر اور میرے گھر والوں پر بیت رہی تھی۔تو دوسری طرف یہ پولیس کچہری کے چکر پھر بدنامی الگ ہورہی تھی کہ آخر میں نے ایسا کیا جرم کیا تھا کہ مجھے D.P.R کا نشانہ بنادیا گیا۔جس میں نہ ضمانت ممکن تھی اور نہ ہی وقت کا تعین کہ کتنے دن اور کہاں رکھا جائے گا لہذا میں انڈر گراؤنڈ ہوگیا اس کی وجہ اس بھیانک ڈی پی آر کا قانون تھا۔جس سے بچنا ضروری تھا۔اب پولیس اور ڈرگ انسپکٹرز میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔آخر کار ایک دن انہوں نے مجھے دھوکہ سے میرے دفتر میں گھس کر گرفتار کرلیا اور اس طرح پاکستان کی تاریخ میں ایک صنعت کار ڈی پی آر کا پہلا نشانہ بنا۔جس کا دُور دُور تک سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔آرام باغ پولیس نے سرجن نصیر شیخ کی شکایت پر میرے خلاف بغاوت کا مقدمہ درج کرلیا اس شکایت نامہ میں تحریر تھا کہ میں نے عوامی حکومت کے خلاف تمام فیکٹری کے ورکروں کو اُکسایا۔ہڑتال کرائی جلوس نکالا۔حکومت کے خلاف نعرے بازی کی۔اگر مجھے نہ روکا گیا

1967ء میں پہلی سیلز کانفرنس کے موقع پر ام یمن کمپنی کے ڈائریکٹر برائے پاکستان کے ساتھ۔

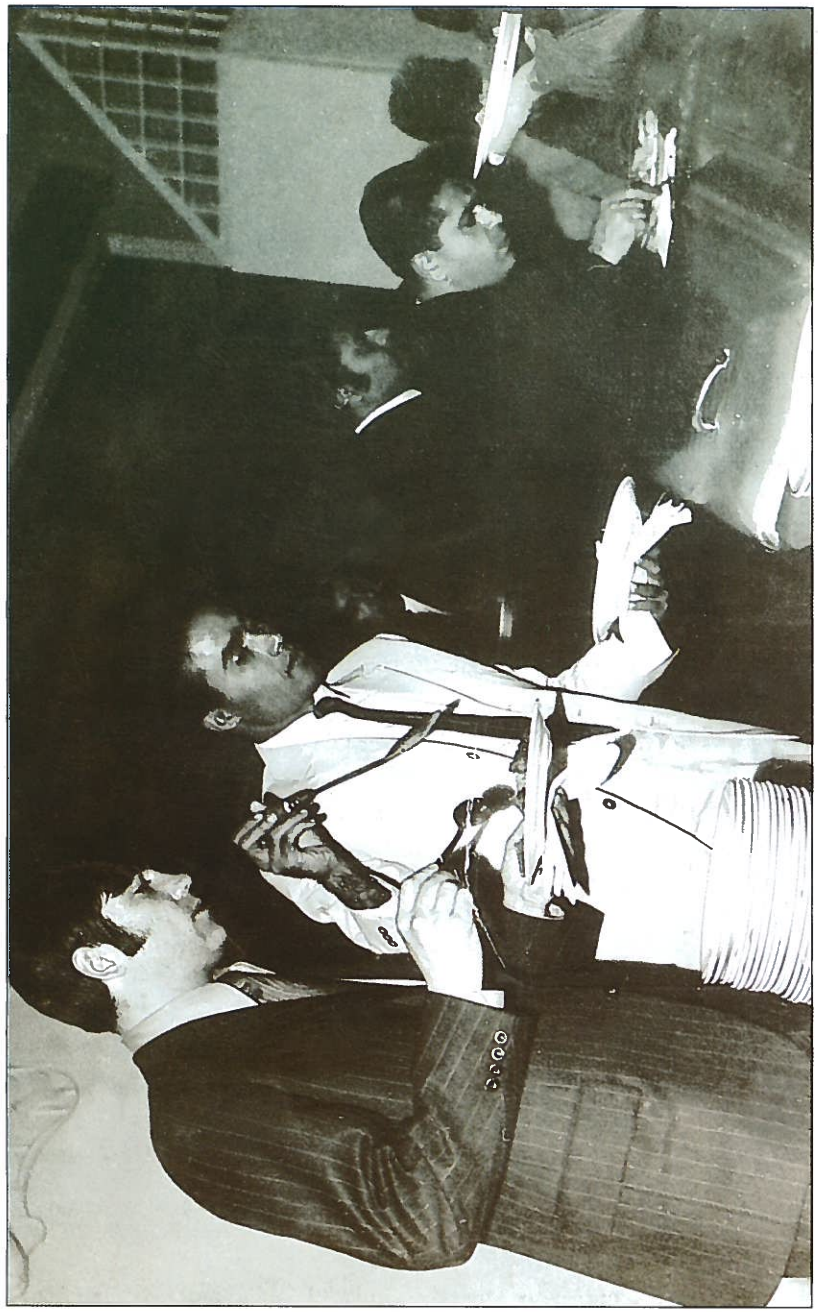

تو کراچی میں لاء اینڈ آرڈر کی صورت خراب ہوجائے گی ۔اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے ناجائز ذرائع سے پولیس کی مدد سے ضمانت قبل از گرفتاریاں منظور کروائیں ۔اور وزارت صحت کے خلاف عوام کو اُکسایا۔لہذا ضروری ہوگیا تھا کہ مجھے ڈیفنس آف پاکستان کے قانون کے تحت گرفتار کر کے عبرت ناک سزا دی جائیں۔ مجھے شام 4 بجے میرے آرام باغ دفتر سے گرفتار کیا گیا تھا۔لہذا آرام باغ تھانے میں رات رکھا گیا اور مجھے کسی سے بھی نہیں ملنے دیا گیا۔گویا کہ میں بہت ہی خطرناک قیدی ہوگیا تھا۔تھانہ بہت چھوٹا تھا اور گندہ تھا اس میں دو تین قیدی بھی تھے ۔رات کی دوسرے انچارج کی ڈیوٹی تھی ۔اُس نے میرا نام پڑھا تو وہ میرا واقف کار نکلا ۔اُس نے گھر سے کھانے کی اجازت دے دی۔ اُس نے مجھ سے مل کر کہا کہ چونکہ میں D.P.R کا قیدی ہوں اس لئے زیادہ مدد نہیں کرسکتا۔البتہ مجھے لاکر کے بجائے اپنے کمرے میں بٹھا دیا۔اُس کرسی پر میں رات بھر اُونگھتا رہا۔یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ مجھے واپس تھانے کے لاکر میں ٹرانسفر کردیا گیا۔تقریباً 11:00 بجے مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔اور مجھے ڈائریکٹ جیل منتقل کردیا گیا۔جیل میرے لئے ہی نہیں میرے خاندان کے لئے بھی ایک پہلا تجربہ تھا۔جیل میں اندر جانے کے بعد ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ لال ٹوپی پہنے ایک قیدی آیا۔اُس نے مجھے سے پوچھا کہ میں کس جُرم میں لایا گیا ہوں ۔میری عمر اُس وقت صرف 33 سال تھی۔وہ سمجھا میں اسٹوڈنٹ لیڈر ہوں یا سیاسی نوجوان جو حکومت کے خلاف جلسہ جلوس نکالنے پر لایا گیا ہوگا۔میں نے سرسری طور پر بتایا کہ نہ میں سیاسی لیڈر ہوں نہ اسٹوڈنٹ لیڈر مجھے بھٹو صاحب کے خاص معالج خصوصی کی دشمنی یہاں تک لے آئی ہے۔وہ اطمینان سے بیٹھ گیا کہنے لگا اب تو تم اندر آچکے ہو تمہیں رات ایک بڑی بیرک میں بند کردیا جائے گا صبح تمہارا معائنہ ہوگا اور اسی بیرک میں جس میں 200 سے زائد قیدی ہونگے رکھا جائے گا اگر تم چاہو تو ایک الگ کھولی نما کمرہ بھی ہے اگر تم پچیس ہزار روپے دو تو دوسرے دن تمہیں وہاں منتقل کردیا جائے گا۔اس کھولی میں صرف دو افراد ہونگے وہ

حیدرآباد کے اسپتال کے افتتاح کے موقع پر 1982ء

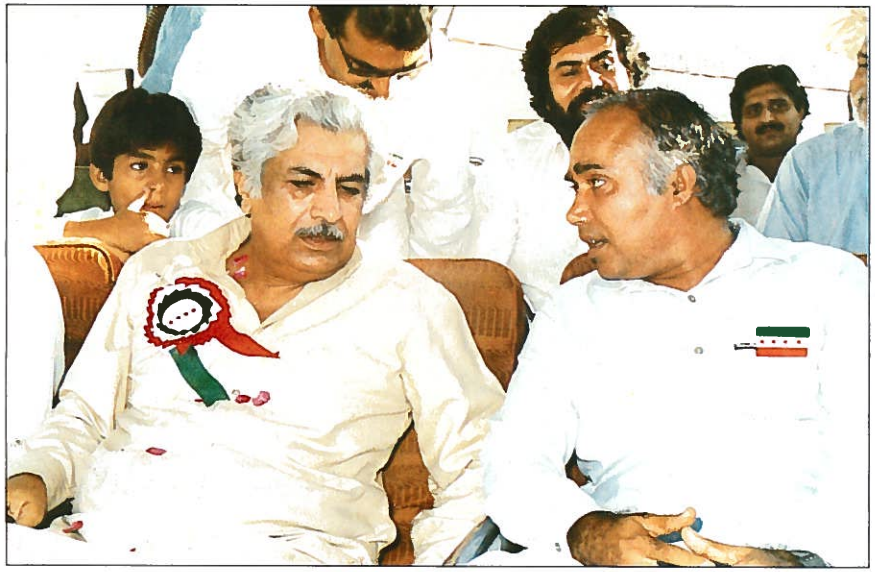

غلام مصطفےٰ جتوئی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے

بھی تمہاری طرح پڑھے لکھے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے پاس تو جو چند سو روپے تھے وہ جیل کے دفتر میں آتے ہی جمع کر لئے گئے پھر اتنی بڑی رقم کیسے دے سکتا ہوں اور پھر مجھے کیا پتہ کہ تم مجھے اس کمرے میں رہنے بھی دو گے یا چند دن بعد پھر بیرک میں منتقل کر دو۔ اُس نے بڑی ہمدردی اور نرم لہجہ میں کہا تم مجھے بہت شریف آدمی لگتے ہو۔ اور تمہارے ساتھ زیادتی بھی ہوئی ہے۔ مگر میں تمہارے ساتھ یہاں کوئی غلط بات نہیں کروں گا۔ تم مجھے کل کھولی (کمرہ) دیکھ کر ایک چٹ لکھ دینا۔ میرے آدمی تمہارے گھر والوں سے مل کر یہ پچیس ہزار روپے لے آئیں گے۔ میں نے کہا کہ پچیس ہزار روپے تو بہت زیادہ ہیں۔ اگر رقم کم کرو تو بات بن سکتی ہے۔ اُس سے کافی بحث و مباحثے کے بعد رقم دس ہزار روپے طے پائی۔ اُس نے کہا جب دوسرے دن نائب جیلر سے ملے تو میرا ذکر ضرور کر دینا ویسے میں بھی اُس کو اسی سودے کا بتلا دوں گا۔ رات اُس بھیانک بیرک میں گزری میلے کچیلے کمبل اوڑھنے کو ملے اور ٹاٹ نما دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دسمبر کا مہینہ تھا سخت سردی تھی 200 سے بھی زائد خطرناک صورتوں والے قیدی تھے۔ میں اُن سے الگ تھلگ ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اُن کے کپڑوں اور جسم سے بدبو آ رہی تھیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اللہ سے گلہ کیا کہ مجھے کس جرم کی سزا میں لایا گیا ہے۔ اور کب تک مجھے یہاں رہنا پڑے گا۔ کیونکہ DPR میں نہ تو ضمانت ہوتی تھی اور نہ ہی کسی کو معلوم ہوتا تھا کہ کب رہائی ملے گی یہ ایک اندھا قانون تھا جس کا فیصلہ حکام بالا کرتے تھے۔ جو DPR میں بھجواتے تھے۔ اس میں صرف مقدمے کی تاریخ لگتی تھی نہ وکیل کی شنوائی تھی نہ جج کچھ کر سکتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے صبح ہوئی۔ مجھے اس گندے بیرک سے نکال کر ڈپٹی جیلر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس کو میں نے اُس لال ٹوپی والے کی بات بھی بتائی۔ اُس نے کہا کہ دس ہزار بہت کم ہیں۔ میں نے کہا میرا کاروبار تو کب سے حکومت نے بند کر رکھا ہے۔ اگر تم نہیں چاہتے تو بیشک مجھے بیرک میں رہنے دو۔ بہرحال اُس نے کہا چونکہ تم پہلے ہی دکھی ہو چلو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں یہ کہہ کر اُس نے گھنٹی بجائی

اسماعیل اللہ والا گرلز کالج کے افتتاح کے موقع پر نسیم اللہ والا نمایاں ہیں

جمعیت پنجابی سوداگران دھلی کے بحیثیت صدر پہلے اجلاس کا فوٹو 1999ء

ایک سنتری آیا۔اُس کو حکم دیا کہ مجھے کھولی نمبر 5 میں لے جائے یہ بڑے صاحب کے مہمان ہیں۔میں دو راتوں سے تھکا ہوا تھا۔رات کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا کیونکہ اتنا بدشکل شوربہ مجھے اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں ملا تھا۔رغبت نہیں آئی اور بھوک بھی مٹ چکی تھی۔کھولی میں ایک پلنگ تھا۔اُس پر لیٹا ہی تھا کہ نیند آ گئی سارا دن سوتا رہا۔اُس کھولی میں میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔میرے حکومت سندھ میں کافی دوست تھے۔اُن میں مجسٹریٹ،ایس ڈی ایم،ڈی آئی جی،ایس ایس پی شامل تھے۔اُن کو میرے بھائی نے جا کر بتایا انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ صرف جیل کے اندر آسانیاں دلوادیں گے۔ رہائی کسی کے بس میں نہیں تھی۔DPR کے ملزم صرف بھٹو صاحب کے حکم سے اندر اور باہر ہوتے تھے۔غالباً نصیر شیخ نے بھٹو صاحب کو غلط کہانی سنائی ہوگی۔اس وجہ سے انہوں نے مجھے سیکرٹری داخلہ محمد خان جونیجو کو DPR میں بند کرنے کا آڈر جاری کیا تھا۔بہرحال شام چار بجے میں سو رہا تھا کہ ایک سنتری (جیل میں پولیس والے کو سنتری کہتے ہیں) بھاگا ہوا آیا میری کھولی سے تالا کھولا بڑے احترام سے کہنے لگا۔آپ کو جیلر صاحب نے بلایا ہے۔میں راستے میں ہی تھا کہ وہ ٹوپی والا قیدی میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ اس دس ہزار والے واقعہ کا ذکر نہیں کریں گے چاہے تو آپ پیسے کی چٹ بھی واپس لے سکتے ہیں۔میں نے اُس کو جواب دیا پہلے میں جیلر صاحب سے مل آؤں پھر بتاؤں گا۔ میں جیلر کے کمرے میں پہنچا اُس نے اُٹھ کر مصافہ کیا حال احوال پوچھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے میں نے کہا کہ میں سگریٹ پیتا ہوں،جیل میں آتے ہی ڈنل ہل کے جو دس پیکٹ میرے ساتھ تھے وہ لے لیئے گئے اور گھر سے کھانا منگوانا چاہتا ہوں۔اُس نے فوراً ڈپٹی جیلر کو بلا کر ڈانٹا۔میرے پان سگریٹ پیسے سب واپس کروائے اور فوراً مجھے ایک صاف کمرے میں جو اسی کھولی کے برابر تھا منتقل کر دیا اور کہا کہ ڈی آئی جیل خانہ کا فون آیا تھا اور ایک دو ایس ڈی ایم نے بھی آپ کے متعلق بات کی تھی یہ ٹیلفون پر ڈی آئی جی صاحب سے بات کرلیں کہ آپ کو تمام سہولتیں جو سی کلاس کے لئے ممکن تھی معہ کھانا گھر

بیٹے سلمان خلیل کی شادی کے موقع پر اہلیہ، بیٹی اور بیٹوں کے ساتھ

سے لانے کی اجازت دے دی ہے۔اور میری بھی تعریف کردیں۔تا کہ وہ خوش ہوجائیں۔میں نے ٹیلفون پر اپنے دوست ڈی آئی جی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور جیلر صاحب کی بھی تعریف میں چند کلمات کہے۔جیلر صاحب نے خوش ہوکر مجھے بھی بات کرائی اور کہا کہ آپ کے گھر والے جب بھی مجھ سے ملنا چاہیں میرے کمرے میں ملاقات کرادوں گا۔پھر واقعی انہوں نے میرے دوست احباب بھائی وغیرہ جو بھی مجھ سے ملنے آتا مجھ سے ملاقات کروائی۔

اب مجھے جیل میں گھومنے پھرنے کی آزادی تھی گھر سے کھانا بھی آرہا تھا۔ایک ہفتے کے بعد ڈی پی آر کی عدالت میں پیشی ہوئی۔اُس وقت عدالت کے تین جج ہوتے تھے اتفاق سے ایک جج میرا پرانا واقف کار نکلا۔میرے وکیل نے بی کلاس کی درخواست دے رکھی تھی۔عام طور پر بی کلاس نہیں دی جاتی تھی۔ مگر چونکہ وہ میرا پرانا دوست تھا۔اُس نے اپنے دونوں ساتھی ججوں سے بات کر کے مجھے بی کلاس دے دی۔اور اپنے چپراسی سے کہلوایا کہ میں نے بی کلاس دلوادی ہے اور گھر کے تمام افراد تم سے مل سکتے ہیں، گھر سے کھانا بھی بھجوا سکتے ہیں۔اس کیلئے مجھے معاف کردینا کہ میں تمہاری ضمانت لے کر رہا نہیں کروا سکتا، یہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے اس کے لئے تم ہوم سیکرٹری کو درخواست دے سکتے ہو۔دوسرے دن میرے وکیل نے جیل میں مجھ سے ملاقات کی یہ وکیل میرے بہت پرانے اور ذاتی دوست تھے۔جنہوں نے میرے بھائیوں سے فیس بھی وصول کی اور بی کلاس دلوانے کے لئے کافی رقم الگ لی۔حالانکہ بی کلاس میرے جج نے دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے مجھے مطلع بھی کردیا تھا۔میں نے یہ انکشاف جب وکیل صاحب کو کیا تو وہ مجھ سے ناراض ہوگئے اور میرا کیس بھی واپس کردیا۔یہی نہیں جب فیکٹری بند ہوئی تو میرے صرف چند دوستوں کے سوا کسی اور نے مجھ سے جیل میں ملاقات کا رسک نہیں لیا کہیں سرجن نصیر شیخ کو نہ معلوم ہوجائے اور تو اور میرے کئی ڈسٹری بیوٹر صاحبان نے تو اپنے حصہ کی رقم تک ہضم کرلی اور کہا کہ فیکٹری بند ہوجانے سے ہمارا مال واپس آرہا ہے اور بہت سے

بیٹے سلمان خلیل کے ولیمہ کے موقع پر عزیز و اقارب کے ہمراہ

دوکانداروں نے پیسے دینے سے انکار کر دیا ہے۔لہذا وہ بھی یہ رقم نہیں ادا کر سکتے۔اسی طرح مجھے بیک وقت کئی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔اول فیکٹری ورکرز جو آگ سے متاثر تھے اُن کا علاج و پلاسٹک سرجری کرانا۔دوم دفتر کے مستقل ملازموں کی تنخواہیں،ڈسٹری بیوٹرز کا پیسے دینے سے انکار پھر تمام کاروبار کا بند ہونا۔ان حالات میں میں نے اپنے تمام قرض داروں کا جن سے پیکنگ اور خام مال آتا تھا حساب بے باق کر دیا۔کیونکہ مجھے امید تھی کہ نصیر شیخ کی موجودگی میں مجھے ادویات سازی کا لائسنس ملنے کا امکان نہیں تھا۔اسی دوران میرے بھائی صاحب نے ہمارے دوست پیر آفتاب شاہ جیلانی سے ملاقات کی اور میرے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ذکر کیا اتفاق سے اُنہی دنوں بی کلاس میں کافی سیاستدان بھی نظر بند تھے۔جن میں جسارت اخبار کے مولانا صلاح الدین مرحوم ،نفیس صدیقی ،جماعت اسلامی کے بہت سے کارکن اور چوہدری ظہور الٰہی مرحوم نظر بند تھے۔ان ڈھائی ماہ میں سیاست پر کافی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔صبح سے لے کر رات گئے تک سیاسی باتوں سے مجھے بھی دلچسپی ہوتی گئی اُن دنوں بھٹو صاحب نے قبل از وقت الیکشن کروانے کا اعلان کر دیا۔جس کے بعد پی این اے وجود میں آ گئی۔تمام مخالف سیاست داں اکھٹے ہو گئے اور پی پی پی کے خلاف عوام میں نفرت پیدا ہو گئی۔جوں جوں وقت گزر رہا تھا متحدہ اپوزیشن بھٹو صاحب کا گھیرا تنگ کر رہی تھی تو دوسری طرف بھٹو صاحب تنہا الیکشن جیتنے کا پلان بنا رہے تھے۔پہلے مرحلے میں انہوں نے چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بلا مقابلہ دھاندلیوں سے کامیاب کروایا۔جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔پھر انہوں نے اُن کے مخالف امیدواروں کو اغوا کروا کر ان کی کاغذات نامزدگی داخل ہی نہیں کرنے دیئے۔اس کا عوام پر بہت بُرا اثر پڑا۔خوش قسمتی سے بھٹو صاحب میر پور خاص کے دورے پر آئے تو پیر آفتاب شاہ جیلانی اور اُن کے والد صاحب پیر غلام رسول شاہ جیلانی نے بھٹو صاحب کو میرے ساتھ ہونے والی زیادتیوں سے آگاہ کیا۔بھٹو صاحب نے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا اور میری رہائی کا فوری طور پر ہوم

بیٹی صبوحی کی شادی کے موقع پر خاندان کے ہمراہ

سیکرٹری کو آڈر کر دیا۔ اس طرح ڈھائی ماہ میں اس ناکردہ گناہ کی قید سے آزادی ملی۔

اتفاق سے رہائی کے دوسرے ہی دن کراچی میں پی این اے کا مشہور زمانہ جلوس نکالا گیا۔ جلوس جب شہید ملت روڈ کے کراسنگ پر پہنچا تو ہماری برادری کے علاوہ تمام آس پاس کی آبادی اس جلوس کو دیکھنے پہنچی ہوئی تھی۔ جس میں میں بھی شامل تھا۔ اصغر خان اس جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ میں نے سوچا اب جیل کی ہوا بھی کھالی ہے تو کیوں نہ سیاست میں حصہ لیا جائے۔ تحریک استقلال کے صدر اعجاز محمود صاحب سے تو پہلے ہی سے ملاقات تھی وہ کہتے ہی تھے کہ تاجروں اور صنعت کاروں کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے۔ تو میں اس جلوس کے ساتھ ساتھ برنس روڈ تک گیا۔ رات گئے تک وہاں جلسہ ہوتا رہا۔ تمام سیاست دانوں کی تقریریں سنی مجھے اصغر خان کی تقریر اور صاف گوئی پسند آئی۔ تو اگلے ہفتے میں نے اعجاز محمود صاحب سے ملاقات کی اور میرے بہت سے پرانے دوست بھی ان سے ملے تو ہم نے تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کر لی۔ ادھر قصہ مختصر بھٹو صاحب نے الیکشن کروائے۔ جس پر اپوزیشن نے دھاندلیوں کا الزام لگایا اور صوبائی الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ پھر آپس میں رسہ کشی شروع ہوئی اور 5 جولائی 1977ء کو بھٹو صاحب کو فوج نے مارشل لاء لگا کر حکومت سے الگ کر دیا اور یوں جمہوریت کا گلہ گھونٹ دیا گیا۔ بھٹو صاحب کی حکومت جانے کی سب سے زیادہ مجھے خوشی تھی۔ کیونکہ میرا تمام کاروبار ختم ہو چکا تھا۔ مارشل لاء خود عوام کی پزیرائی حاصل کر چکا تھا۔ بھٹو صاحب نظر بند تھے سیاست دان اُن سے مل کر حکومت چلانا چاہتے تھے۔ ایسے میں ایئر مارشل اصغر خان صاحب میری باقاعدہ شمولیت کے لئے میرے گھر تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ خورشید محمود قصوری، نواب اکبر بگٹی۔ ایڈمرل مظفر حسین، اعجاز محمود شامل تھے۔ دو ڈھائی سو افراد کا اجتماع تھا۔ اصغر خان صاحب نے تقریر کی اور تحریک استقلال کے اغراض و مقاصد بتائے۔ پھر میں نے باقاعدہ اس جماعت میں شمولیت کا اعلان کیا۔ حاضرین نے مبارک بادیں دیں۔ چند ہفتوں بعد تحریک استقلال کی روایت کے مطابق الیکشن

بیٹے خرم خلیل کی شادی کے موقع پر خاندان کے ہمراہ

ہوئے اس سالانہ الیکشن میں میں سنیئر نائب صدر منتخب ہوا۔اور ایڈمرل مظفر حسین چیئرمین کراچی منتخب ہوئے۔ایک طرف سیاست چل رہی تھی تو دوسری طرف نئی فوجی حکومت نے تمام ادویات سازی کے لائسنس بحال کر دیئے۔میرا لائسنس بھی بحال ہوگیا۔فیکٹری بھی کھل گئی۔اسی دوران ایک جاپانی کاسمیٹک کمپنی کی سبولی برانڈ متعارف کروایا۔کیونکہ منڈوزا کمپنی کے کھلنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔مگر دوسال کے عرصہ میں کاسمیٹک کا تجربہ کامیاب نہیں رہا۔اس کاسمیٹک کمپنی میں تین ماہ تک اوساکا جاپان میں کاسمیٹکس بنانے کی ٹریننگ بھی لی تھی اگرچہ یہ کمپنی جاپان میں بہت مقبول بھی تھی مگر اس کے باوجود سبولی کی پروڈکس ناکام ہوگئیں۔پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری، یہ صدمہ اور نقصان بھی برداشت کرلیا۔اور اب پلاننگ یہ کی کہ کاسمیٹک میں اپنے ہی نام سے ایک پروڈکٹ متعارف کرائی جائے۔جب وہ کامیاب ہو پھر دوسری کی پلاننگ کی جائے گی۔میں نے دراصل بیک وقت 15 سے زائد پروڈکٹس نکال کر غلطی کی تھی۔آہستہ آہستہ کاسمیٹک پروڈکٹس میں آنے کا تجربہ کامیاب رہا۔ہم نے ٹچ می کا برانڈ متعارف کرایا۔اور پہلا آئٹم ٹچ می ٹالکم پاؤڈر متعارف کروایا۔اللہ کی مہربانی سے وہ کامیاب ہوا۔پھر ایک سال بعد ٹچ می شیونگ کریم متعارف کرائی وہ بھی کامیاب ہوگئی۔اس طرح دواسازی کی طرف سے دھیان کاسمیٹک کی طرف ہوتا چلا گیا۔اور پھر ایک سے ایک پروڈکٹ آتی گئی اور ٹچ می برانڈ نے زبردست مقبولیت حاصل کرلی جو آج تک الحمدللہ قائم ہے۔

دوسری طرف شیخ نصیر جو مارشل لاء دور میں ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے واپس آئے تو فوج نے انہیں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا۔وہ تقریباً ایک سال قید رہے پھر فوج نے انہیں چھوڑ دیا اور وہ اس طرح ملک چھوڑ کر دوبارہ برطانیہ شفٹ ہوگئے۔کئی سال بعد ان کا مجھ سے ہوائی جہاز میں مدینہ سے لندن جاتے ہوئے ٹکراؤ ہوگیا۔انہوں نے مجھ سے اپنی غلطیوں اور زیادتیوں کی معافی مانگی۔جس کو میں نے معاف کر دیا۔اور اس طرح اُن سے دوستی ہوگئی۔

بیٹے جنید خلیل کی شادی کے موقع پر خاندان کے ہمراہ

1983ء میں کاسمیٹکس کی کامیابی کے بعد ٹوتھ پیسٹ کی طرف توجہ دی۔ جرمنی جا کر وہاں ٹوتھ پیسٹ بنانے والی کمپنی سے معاہدہ کیا مال بنانے کے طریقے سیکھے ٹیکنیکل فارمولے خریدے اور اللہ کا نام لے کر ٹچ می نیچرل ٹوتھ پیسٹ متعارف کرایا۔ اس کی کمرشل ایک جنگل یعنی گانے پر مبنی تھی۔ جس کا نغمہ یوں تھا" نیچرل آیا دل میں سمایا چپکے چپکے سارے گھر کو بھایا" نے پورے ملک میں دھوم مچادی چونکہ یہ ایک معیاری ٹوتھ پیسٹ پیکنگ اور ذائقہ کے لحاظ سے بھی منفرد تھا۔ اس وجہ سے بہت ہی کم عرصہ میں ٹچ می ٹوتھ پیسٹ کی دھاک بیٹھ گئی۔ پورے ملک میں زبردست کامیاب ٹوتھ پیسٹ ثابت ہوا۔ اب ادویات سے دور اور کاسمیٹکس کے نزدیک ہوتے گئے۔ 1989ء میں پھر ایک نئے ٹوتھ پیسٹ کے بنانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک حادثہ تھا، فرانس میں میرے دانتوں میں ہمیشہ کی طرح درد اُٹھتا رہتا تھا میں میڈی کیٹیڈ ٹوتھ پیسٹ جو ڈاکٹر لکھتے تھے خرید کر کام چلا لیتا تھا۔ مگر فرانس میں ایک ڈینٹسٹ جو میرے دوست کا بیٹا تھا۔ اُس کو دانت دکھائے تو اُس نے ایک ٹوتھ پیسٹ لکھ کر دیا۔ جو میں نے استعمال کیا تو چند ہی دن میں زبردست فائدہ پہنچا میں نے ایک درجن وہ ٹوتھ پیسٹ خرید کر فرانس سے پاکستان آ گیا۔ اگرچہ ٹوتھ پیسٹ بہت کڑوا تھا۔ مگر اُس سے دانتوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ میں نے اُس کمپنی کو شراکت کی دعوت دی کہ ہم پاکستان میں ان کے ساتھ مل کر ٹوتھ پیسٹ بنانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہم پاکستان میں خواہش مند نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارے سروے کے مطابق پاکستان آبادی کی زیادتی کے باوجود ٹوتھ پیسٹ کی کھپت میں بہت پیچھے ہے۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور اُن کے ساتھ خط و کتابت کرتا رہا۔ مگر جب اُس کمپنی سے بالکل انکار ہو گیا۔ تو میں نے سوچا کہ خود ہی کیوں نہ یہ ٹوتھ پیسٹ بنالوں۔ عام جنرل ٹوتھ پیسٹ تو میں ویسے ہی بنا رہا تھا۔ اللہ کا نام لے کر اُس ٹوتھ پیسٹ کی کیمکل تجزیہ کرایا کہ اس میں کیا کیا خاص چیزوں کا مرکب ہے۔ ساتھ ساتھ کڑواہٹ بھی اس کی ختم کرنی تھی۔

1990ء ہانگ کانگ میں

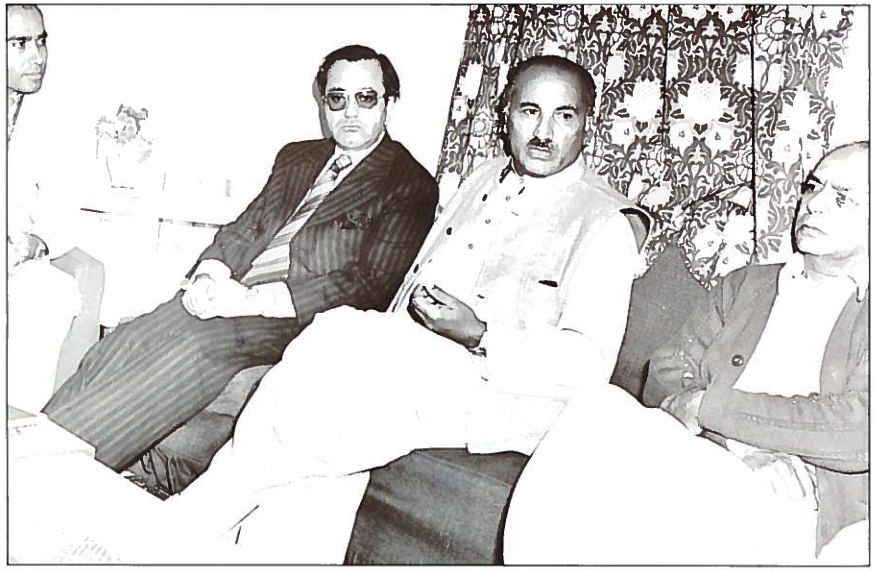

تحریک استقلال میں شمولیت کا فوٹو خورشید قصوری ایڈمرل مظفر اصغر خان نمایاں ہیں

ایک سال تک تجربہ کرتا رہا کہ پھر اللہ نے کرم کیا۔میڈی کیٹیڈ ٹوتھ پیسٹ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔یہ پاکستان کا پہلا میڈی کیٹیڈ ٹوتھ پیسٹ تھا میں نے اس کی مناسبت سے اس کا نام میڈی کیم MEDICAM رکھا میڈی کیم دراصل ہماری ہی جاس اے منڈوزا کا مخفف ہے یعنی میڈی سے مراد میڈیسن اور سی اے ایم بھی جاس اے منڈوزا بنتا تھا رکھ دیا۔ٹوتھ پیسٹ میڈی کیٹیڈ بھی تھا۔اور میٹھا بھی بن چکا تھا۔جس کو بھی استعمال کے لئے دیا اُس نے بار بار مانگا۔پہلے سال یہ میڈی کیم ٹوتھ پیسٹ کو ڈینٹسٹوں کے ذریعے بیچنے کا فیصلہ ہوا ڈاکٹر صاحبان کو ہزاروں سیمپل بھی دیئے مگر ڈاکٹر صاحبان کو تو یقین نہیں آتا تھا کہ ایک پاکستانی کمپنی بھی ایسا ٹوتھ پیسٹ بنا سکتی تھی وہ رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔اسی لئے وہ غیر ملکی ٹوتھ پیسٹ نسخہ میں لکھ کر مریض کو دیتے تھے۔ایک سال ہو چکا تھا۔میڈی کیم ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔لہٰذا سوچا کہ اس کو عام تشہیر کے ذریعے عوام تک پہنچایا جائے۔جس طرح عام ٹوتھ پیسٹ کے لئے ہم نے وہ راستہ اختیار کیا تھا۔اخبارات، ٹی وی اور رسائل سے بیک وقت پبلسٹی شروع کی پہلے ہی سال میں یہ بھی دیگر ٹوتھ پیسٹ کی طرح مقبول ہونا شروع ہوا۔اور آہستہ آہستہ اس نے غیر ملکی میڈی کیٹیڈ ٹوتھ پیسٹ کی جگہ لینا شروع کر دی۔میں خود اس ٹوتھ پیسٹ کی بدولت اب ڈاکٹروں کے علاج سے جان چھڑا چکا تھا۔ایسے میں میں نے اپنے ڈینٹسٹ سے پوچھا میں نے بہت سیمپل دیئے تھے۔آیا اُس سے دانتوں کے مریضوں کو فائدہ پہنچا۔اور کیا وہ نسخہ میں میڈی کیم تجویز کرتا ہے تو ڈاکٹر نے جواب دیا میں نے جس کسی مریض کو یہ ٹوتھ پیسٹ کا سیمپل دیا تو اُس نے آکر مزید سیمپل مانگے اور پھر اب وہ مریض لوٹ کر نہیں آتے۔جس کی زندہ مثال میں خود بھی تھا۔جو اُس ڈاکٹر کے پاس اب علاج کے لئے نہیں جاتا تھا۔مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔تو ڈاکٹر صاحبان اس کے خلاف ہوتے گئے مگر عوام اس کے قریب تر ہوتی گئی۔اس میں کوئی بھی کیمکل اجزاء نہیں تھے۔صرف قدرتی اجزاء تھے جس کا سائیڈ افیکٹ بھی نہیں تھا۔چند ہی سال میں یہ

گورنر سندھ معین الدین حیدر کے ساتھ عشائیے کے موقع پر گروپ فوٹو

پاکستان کا مقبول ترین ٹوتھ پیسٹ بن گیا۔ ہمارے اس پیسٹ کی زبردست کامیابی نے ہمارے دیگر کمپیٹیٹرز حضرات کو جگا دیا۔ انہوں نے اس سے ملتے جلتے ناموں سے ٹوتھ پیسٹ بنانے شروع کر دیئے۔ تمام عام ٹوتھ پیسٹ بنانے والے میڈی کیم کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک درجن کے قریب ٹوتھ پیسٹ صرف ایک سال میں مارکیٹ میں آ گئے۔ عوام نے یکے بعد دیگرے ان ٹوتھ پیسٹوں کو استعمال کر کے دیکھا۔ بعض لالچی دوکانداروں نے ان ملتے جلتے ناموں کے ٹوتھ پیسٹ اپنے خریداروں کو بھی دیئے کہ یہ بہت اچھا ہے کیونکہ ملتے جلتے ٹوتھ پیسٹ بنانے والے زیادہ کمیشن اور مفت سیمپل دیتے تھے۔ مگر ان ٹوتھ پیسٹ میں میڈی کیم جیسی افادیت نہیں تھی۔ ایک کمپیٹیٹر نے تو حد کر دی بالکل اُسی جیسے حروف تہجی کے ساتھ ایک ٹوتھ پیسٹ متعارف کروایا۔ وہ فیل ہوا پھر آدھے داموں پر دوسرا ٹوتھ پیسٹ متعارف کرایا اور جی بھر کر ہمارے ٹوتھ پیسٹ کے خلاف محاذ کھڑا کیا۔ مگر الحمدللہ تمام ملتے جلتے ناموں والے ٹوتھ پیسٹ آہستہ آہستہ مارکیٹ سے غائب ہو گئے۔ ایک تو لطیفہ بھی پیش آ گیا۔ میں تفریح کے واسطے سوات جا رہا تھا راستہ میں ایک بہت بڑی چڑھائی آتی ہے۔ اُس کا نام مالاکنڈ ہے وہاں عام طور پر سوات اور پنڈی پشاور سے آنے جانے والے حضرات کولڈ ڈرنک یا چائے پینے کے لئے اپنی گاڑیاں روکتے ہیں۔ اتفاق سے میں بھی کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔ کہ ایک دیہاتی کمبل اوڑھے اُس دوکان پر آیا اور میڈی کیم ٹوتھ پیسٹ مانگا۔ اُس دوکاندار نے جھٹ میرے نام سے ملتا جلتا ٹوتھ پیسٹ دے دیا میں چونکہ قریب ہی کھڑا تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا کہ وہ غلط قسم کا ٹوتھ پیسٹ کیوں دے رہا ہے۔ میں نے اُس دوکاندار سے پوچھا کہ تم اصلی میڈی کیم کیوں نہیں دے رہے ہو۔ تو اُس نے کہا بابو جی یہ دونوں ٹوتھ پیسٹ دو بھائیوں نے بنائے ہیں۔ اب چونکہ وہ الگ ہو چکے ہیں۔ تو دوسرے بھائی نے اس سے ملتا جلتا نام رکھ لیا۔ آپ بے فکر ہو کر یہ ملتا جلتا ٹوتھ پیسٹ لے جائیں۔ میں نے فوراً کہا کہ جناب آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے۔ میڈی کیم میرا برانڈ ہے اور میرے ایک بھائی اللہ کو

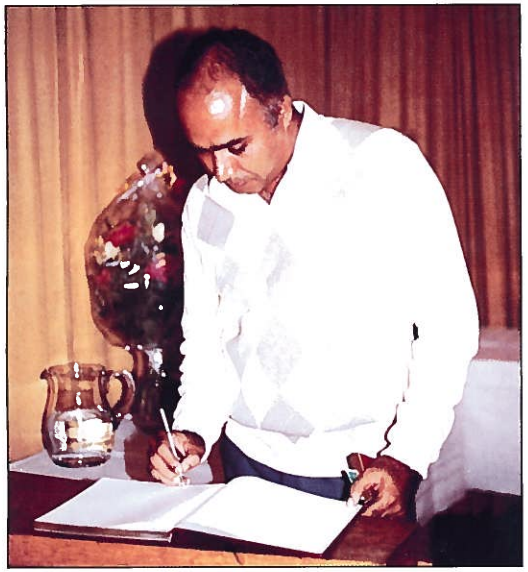

جرمنی 1986 ٹوتھ پیسٹ کمپنی میں اپنے خیالات لکھ رہے ہیں۔

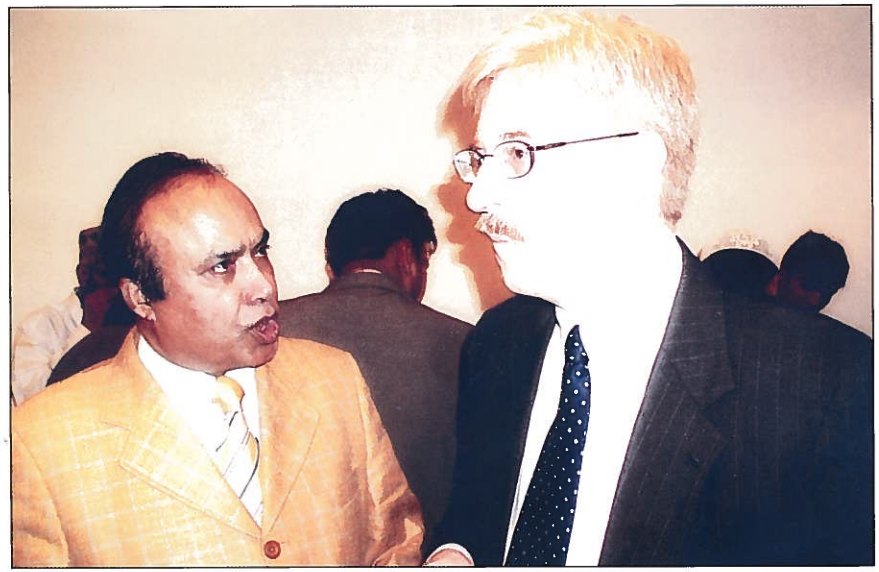

امریکن کونسل جنرل کے ساتھ ایک تقریب میں

پیارے ہو چکے ہیں۔اور دوسرے بھائی خود میرے ڈسٹری بیوٹر ہیں۔اب بتائیں وہ چوتھے بھائی کہاں پائے جاتے ہیں۔میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں تو دوکاندار بہت شرمندہ ہوا اور جھینپ مٹانے کے لئے کہنے لگا۔اس ملتے جلتے ٹوتھ پیسٹ بنانے والے ایجنٹ نے تو یہی بتایا تھا کہ یہ دو بھائیوں کی ملکیت تھا۔اب دونوں بھائی الگ ہو چکے ہیں۔لہذا دونوں نے اپنے اپنے نام سے ٹوتھ پیسٹ بنا دیا۔ایک اور واقعہ پیش آیا۔ہمارے ایک کمپیٹیٹر صاحب نے جو غیر ملکی برانڈ کا ٹوتھ پیسٹ بناتے تھے۔یہ پروپیگنڈہ بھی کر دیا کہ اس میڈی کیم میں نقصان دہ اجزاء ملائی گئی ہیں۔جس میں کارٹی زون ڈالا گیا ہے۔اور ڈاکٹر صاحبان تو پہلے ہی میرے ٹوتھ پیسٹ سے چڑے ہوئے تھے۔انہوں نے بھی اُن سے رشوت لے کر پروپیگنڈہ کیا۔اور وزارت صحت کو بھی لکھ دیا۔میں نے میڈی کیم ٹوتھ پیسٹ کا سیمپل کراچی یونیورسٹی کی واحد لیباٹری جسے H.E.J کہا جاتا ہے۔اُس کو بھیجی جس کی تجزیہ کی فیس جو تقریباً پچاس ہزار روپے سرکاری ٹیسٹنگ فیس فی سیمپل انہوں نے مانگی تو میں نے دے دی۔اُن کی تقریباً 40 صفحوں کی رپورٹ آئی اور اس نے ثابت کیا کہ اس ٹوتھ پیسٹ میں کوئی بھی نقصان دہ اجزاء نہیں ہے اور یہ دانتوں کے لئے بالکل بہت مفید ہے۔اس ٹوتھ پیسٹ میں نمک لونگ پودینہ کا ست وغیرہ پڑتا ہے جو خود کئی صدیوں سے ہمارے بزرگان استعمال کرتے آرہے ہیں۔وزارت صحت نے بھی میڈی کیم کو بے ضرر قرار دیا۔اور یوں اُن مہربان کو بھی منہ کی کھانی پڑی۔باوجود اُن کی کمر پر بڑے بڑے ڈینٹل سرجنوں کا ہاتھ تھا۔میرا یہ ایمان ہے آپ کسی کو ایک یا دو مرتبہ دھوکہ تو دے سکتے ہیں۔بار بار دھوکہ نہیں دے سکتے۔اور یہی وجہ ہے کہ میڈی کیم آج بھی نوجوانوں اور خصوصاً 35 سے 40 سال کی بڑی عمر کے افراد اور خواتین کی ضرورت بن چکا ہے۔اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ہم چھالیہ اور سخت چیزیں جن میں ہڈیاں ہوتی ہیں۔چبا چبا کر کھاتے ہیں۔اور دانت بھی صاف نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے دانتوں میں امراض بڑھ رہے ہیں۔ایک تجزیہ کے مطابق پاکستان کی آبادی 15 کروڑ

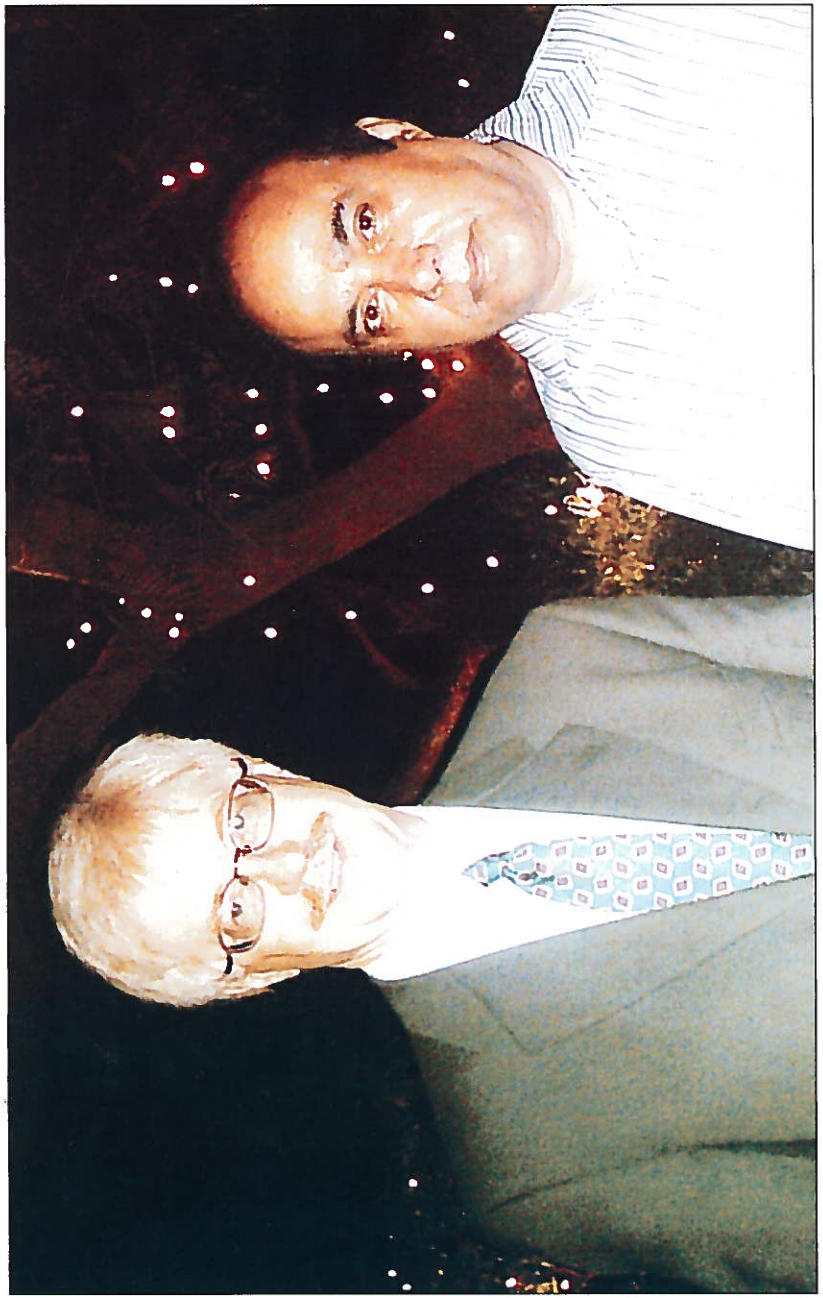

2004ء امریکی کونسل جنرل کے ساتھ ایک تقریب میں

ہے۔جبکہ 15 کروڑ ٹوتھ پیسٹ تمام برانڈ ملا کر بھی ہمارے ملک میں نہیں بنتے۔یعنی ایک ٹیوب فی پاکستانی ایک سال میں بھی استعمال نہیں کرتا۔جو بہت خطرناک علامت ہے۔ہماری وزارت صحت کو چاہئے کہ اس پر سیلز ٹیکس ختم کرے جیسا کہ دیگر ادویات پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔میڈی کیم دانتوں کی نایاب دوا بھی ہے۔اور روزمرہ کا ٹوتھ پیسٹ بھی ہے۔اب ماشاء اللہ خلیجی ریاستوں جس میں عرب امارات،سعودی عرب،کویت،قطر،بحرین،مسقط،امریکہ،برطانیہ،کینیڈا الغرض جہاں جہاں پاکستانی رہتے ہیں الحمداللہ ان تمام ممالک میں پاکستانی اور انڈین دوکانوں پر یہ دستیاب ہے۔آہستہ آہستہ یہ غیر ملکی باشندے جو پاکستان سے آکر اپنے ملک میں جاتے ہیں۔تو اپنے ساتھ درجن بھر ٹوتھ پیسٹ صرف میڈی کیم لے جاتے ہیں میڈی کیم ٹوتھ پیسٹ کی کامیابی کے بعد میں نے میڈی کیم شیمپو بنانے کا فیصلہ کیا۔یہاں ایک بات بتانا ضروری ہے کہ اُس سے قبل سبولی شیمپو،چُچ می شیمپو،سافٹ شیمپو بنانے کی کوشش ناکام ہوچکی تھی یہ تقریباً سات واں تجربہ تھا۔بہت سے فارمولے ہم آزما چکے تھے۔ اتفاق سے جرمنی کی ایک کمپنی نے شیمپو کے لئے کئی مفید قدرتی اجزاء پر مبنی سلوشن تیار کئے تھے۔جس میں بالوں کی مضبوطی کے علاوہ بالوں کا گرنا بھی بند ہوجاتا تھا۔ہم نے اسے ایک سال تک ہزاروں خواتین اور مردوں پر آزمایا اور اُن کو مسلسل مفت سیمپل دیئے۔جب ان استعمال کرنے والوں نے بار بار فرمائش کی اور بتایا کہ اُن کے بالوں کی نشوونماء میں بہت تیزی آئی ہے۔اور بالوں میں مضبوطی کے علاوہ چمک بھی آئی ہے۔تب جا کر ہم نے اس کو میڈی کیم شیمپو کے نام سے مارکیٹ کیا۔خدا کے فضل سے پہلے ہی سال اس نئے شیمپو کی مارکیٹ میں بڑی پذیرائی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ مارکیٹ میں چھا گیا ۔اور آج پاکستان کا نمبر 1 شیمپو کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔اس شیمپو کی ایک خصوصی وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے پہلی بار پورے مہینہ کا شیمپو صرف 25 روپے میں عوام کو دیا۔یہ آئیڈیا کلک کر گیا۔اور اس میں ہربل، سیکا کائی،کلونجی،اینٹی ڈینڈرف یعنی خشکی دور کرنے کا شیمپو اور بالوں سے جوئیں ختم کرنے کا شیمپو غرض

غیر ملکی وفد میں سلمان خلیل کے ساتھ گروپ فوٹو۔

حیدرآباد میں خالق جی خان کے انتقال کے بعد فاتحہ خوانی میں

آٹھ قسم کے شیمپو مارکیٹ کرنے کا صرف میڈی کیم کو اعزاز حاصل ہوا۔ جو پورے پاکستان میں پسند کیا جانے والا پہلا پاکستانی ادارہ ہے جس کے تمام شیمپو کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ دوسری طرف اسی شیمپو کے ساشے بھی مارکیٹ کرائے گئے۔ جو الحمداللہ دن بہ دن غیر ملکی شیمپوؤں کی جگہ مقبولیت میں آگے آچکے ہیں۔ گویا بیس سال بعد جا کر اللہ تعالی نے ہمارے شیمپوؤں کو کامیابی عطا کی۔ اس کی بہترین وجہ اس کی پیکنگ، مناسب دام اور بہترین فارمولے ہیں۔ جو دنیا کے کسی بھی شیمپو سے کم نہیں ہیں۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ وہ اُن غیر ملکی شیمپو سے بہتر ہیں۔ اور انتہائی مناسب قیمت پر دستیاب ہیں۔ تو غلط نہیں ہوگا۔ اس دعویٰ کو عوام نے سال ہا سال سے استعمال کر کے میرے دعویٰ کو صحیح بنا دیا ہے۔ انشاء اللہ ان میں اور بھی نئے شیمپو شامل کئے جائیں گے۔ غالباً یہ دنیا کی واحد کمپنی ہوگی جس کے 10 قسم کے شیمپو تیار کرنے کا ریکارڈ حاصل ہوگا۔ میڈی کیم برانڈ میں پھر ہم نے کریم تیار کی جس کا نام میڈی کیم بلیچ کریم اور میڈی کیم فریکل کریم ہے۔ الغرض میڈی کیم ٹچ می یہ دونوں برانڈ پاکستان میں بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ اور کاسمیٹکس میں درجہ اول برانڈ کی صف میں سمجھے جاتے ہیں۔ جس میں ٹالکم پاؤڈر، شیونگ کریم، شیمپو، بلیچ کریم، فریکل کریم، ہیئر کلر، کولڈ کریم، ٹوتھ پیسٹ جس میں نیچرل ٹوتھ پیسٹ، منٹو ٹوتھ پیسٹ، میڈی کیم ڈینٹل کریم کا مقام الحمداللہ بہت بلند ہے اور اس وجہ سے وہ عوام میں مقبول ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں سب سے کم قیمت کا ٹوتھ پیسٹ اور شیمپو مارکیٹ کرانے کا سہرہ بھی ٹچ می نیچرل ٹوتھ پیسٹ کو ہے یعنی صرف دس روپے میں اور میڈی کیم شیمپو صرف پچیس روپے میں مل جاتا ہے۔ جسے اعلی معیار کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے جس سے صرف عوام کو دانتوں کی صفائی کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔ اور غیر معیاری ٹوتھ پاؤڈروں سے نجات دلا کر ٹوتھ پیسٹ کی طرف راغب کرنا بھی عوام کی خدمت ہوگی۔

1988ء میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات جس میں سوات شامل ہے وہاں ہم نے کاسمیٹکس کی پہلی

بوہری فرقے کے روحانی پیشوا شہزادہ کلیم الدین کے این اکیڈمی کی وزیٹرز بک میں دستخط کر رہے ہیں

بوہری فرقے کے روحانی پیشوا شہزادہ کلیم الدین کے ساتھ کے این اکیڈمی کے دورے کے موقع پر

فیکٹری مینگورہ میں لگائی ۔ یہ سیر وتفریح کے لحاظ سے تو پاکستان میں جانا پہچانا جاتا ہے ۔مگر حکومت پاکستان نے ٹیکسوں میں مراعات دی تو آج وہاں باقاعدہ انڈسٹریل ایریا وجود میں آچکا ہے۔جس میں پاکستانی کاسمیٹکس کی کمپنیاں سب سے نمایاں ہیں ۔ یہ مراعات بھی میں نے حکومت سے دلوائیں ۔ کیونکہ قبائلی قوانین کے مطابق فاٹا اور پاٹا کے علاقے تمام ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے۔جس سے اہل پاکستان ناواقف تھے ۔جس کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ان پسماندہ علاقوں میں فیکٹریاں لگائی جائیں ۔تو دوہرے فائدے کا ہدف حاصل ہوگا۔ایک طرف وہاں بے روزگاری ختم ہوگی تو دوسری طرف فیکٹریوں کے مالکان کوٹیکسوں سے نجات ملے گی ۔بعد میں حکومت پاکستان کے سی بی آر نے مداخلت کی اور سینٹرل ایکسائز کا قانون ختم کردیا۔اُس کی جگہ فکسڈ ٹیکس کے لئے ہمارے کاسمیٹکس گروپ کو مذاکرات کی دعوت دی۔اور پہلے سال 2 کروڑ روپے فکسڈ ٹیکس کردیا۔جو پندرہ سال میں بڑھتے بڑھتے اب سولہ کروڑ تک پہنچ چکا ہے ۔اس وجہ سے آج تقریباً اٹھارہ کاسمیٹکس کی کمپنیاں وہاں قائم ہیں ۔اور پندرہ سال سے میں اس گروپ کا چیئرمین ہوں ۔اور ہر سال ہم سینٹرل بورڈ آف ریٹیو اسلام آباد کے افسران سے مذاکرات کرکے آنے والے سال کے لئے فیکسڈ ٹیکس کی رقم کا تعین کرتے ہیں ۔جو ہر ماہ قسطوں میں ادا کردی جاتی ہے۔تعجب اس امر کی ہے کہ تمام دنیا سے ایکسائیز ڈیوٹیاں ختم کرکے 6 فیصد سے لے کر پندرہ فیصد تک صرف سیلز ٹیکس نافذ کردیا گیا ہے۔مگر ہمارے ملک میں سنٹرل ایکسائیز ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ پندرہ فیصد سیلز ٹیکس بھی وصول کیا جارہا ہے۔جس سے یقیناً کرپشن اور رشوت میں اضافہ ہوتا ہے۔اور دوسری طرف مہنگائی صنعتکاروں کے کھاتے میں جاتی ہے۔

ووڈورڈز گرائپ واٹر کمپنی (U.K):۔ 1996ء کا سال بھی نئی خوشخبری لایا۔میں نے 150 سالہ پرانی

اے بی سی کلب کے بے بی شو میں

بچوں کا گرائپ واٹر بنانے والی برطانیہ کی کمپنی ووڈورڈ پاکستان لمیٹیڈ جس کا 1973ء سے 1980ء تک کراچی کا ڈسٹری بیوٹر تھا۔اس کے پاکستان کے 100 فیصد حصص خرید لئے ۔ یہ ہمارا پہلا پاکستانی ادارہ تھا جس نے غیر ملکی فارماسیوٹیکل کمپنی خریدی ۔اور اس کمپنی کو نئے سرے سے پورے پاکستان میں متعارف کرایا۔مینڈوزا اور ووڈورڈ پاکستان لمیٹیڈ کے نئے اور پرانے ورکروں سے مل کر الحمدللہ پہلے ہی سال ہم نے اس کی سیل میں 30 فیصد اضافہ کیا۔خسارے میں جانے والی برطانوی کمپنی کا خسارہ پورا کیا ۔اور منافع کی طرف گامزن کیا ۔اور آہستہ آہستہ دس سال میں انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں۔اور اب 100 فیصد سیل میں اضافہ ہوگیا ہے۔نئی نئی بچوں اور بڑوں کیلئے ادویات متعارف کروائی گئیں ۔خاص طور پر بچوں کے اسہال دست وغیرہ کے بعد کمزوری دور کرنے کی دوا پیڈی کیئر سیرپ متعارف کروایا۔جو ڈاکٹروں میں کافی مقبول ہوا۔الغرض اس کمپنی نے زیر سایہ اور بھی نئی پروڈکٹس مثلاً ٹوتھ پیسٹ ،ڈائپرز اور بچوں کے لئے کاسمیٹکس بھی متعارف کرانے کا ارادہ ہے انشاء اللہ بہت جلد اس کمپنی کو دوبارہ بہت بڑے پیمانے پر اشیاء کے اضافے سے بڑا ادارہ بنادیا جائے گا۔

کے این اکیڈمی:۔ 1999ء میں ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی ۔اس کی فروری 1999ء میں کے این اکیڈمی کے نام سے ملیر میں 25 ایکٹر رقبہ پر تعمیر شروع کی گئی ۔اس میں دن میں پڑھنے والے طالب علموں کے علاوہ 200 طلباء کے لئے ہاسٹل کا انتظام ہے۔یہ کیمرج یونیورسٹی کا تعلیمی نظام او لیول اور اے لیول کے طالب علموں کے لئے ہے۔الحمدللہ صرف 15 ماہ میں اس کی چار بڑی عمارتیں یعنی ایجوکیشن بلڈنگ ،ہاسٹل ،لائبریری اور کیفے ٹیریا جس میں ایک ہزار طالب علموں کے بیٹھ کر کھانے کی گنجائش ہے، جون 2000 میں مکمل کر کے داخلہ کا اعلان کروایا۔جس میں پہلے ہی سال 100 طلباء کو ہاسٹل میں داخلہ دیا گیا۔باوجود 200 طلباء نے رجسٹریشن کروایا۔مگر کے این اکیڈمی کے

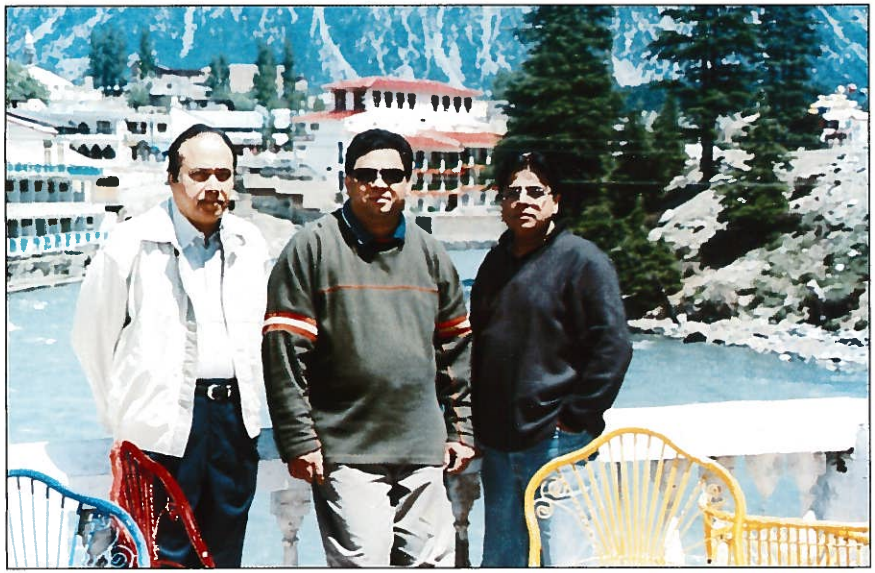

2002ء سوات میں دوستوں کے ساتھ

2002ء سوات میں دوستوں کے ساتھ گروپ فوٹو

معیار پر طلباء پورے نہیں اترے تھے۔لہذا 100 طلباء بورڈنگ میں اور 150 طلباء دن کے لئے منتخب ہوئے۔پھر 15 غریب طلباء کو مفت داخلہ دیا گیا۔صرف تین سال کی مدت میں آڈیٹوریم مکمل طور پر بھر گیا۔اس وقت کے این اکیڈمی میں 700 طلباء پڑھ رہے ہیں۔اور اس کی ایک بچوں کی شاخ عالمگیر روڈ پر منٹیسوری سے لے کر کلاس 6 تک پڑھائی جارہی ہے۔کے این اکیڈمی کا مین کیمپس ملیر میں واقع ہے۔کے این اکیڈمی روڈ کو 50 لاکھ روپے کی لاگت سے کے این اکیڈمی کے خرچ پر تعمیر کیا گیا۔ایک سال کی مدت میں کرکٹ گراؤنڈ چھوٹے بچوں کے لئے چڑیا گھر، سوئمنگ پول، 1000 بچوں کے لئے آڈیٹوریم پڑھانے والے اساتذہ کی فیملی کے لئے 16 اپارٹمنٹس بھی تعمیر کئے گئے۔تاکہ شہر کراچی سے اُن کو لانے اور لیجانے کی تکلیف سے بچایا جاسکے اور شام کی کلاسیں بھی ہوسکیں۔کے این اکیڈمی کی خوبصورت عمارتیں کھیل کے میدان، جمنازیئم، چڑیا گھر، آڈیٹوریم، لائبریری، کیفے ٹیریا اور لیبارٹریز کی عمارتیں پاکستان کی انوکھی اور انفرادی خوبصورتی سے مزّین ہیں۔جس میں رنگ کرنے کے بجائے لال پتھروں سے ڈھکا گیا ہے۔جس کے تین فائدے ہیں۔اوّل تو اس پر رنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔کیونکہ یہ لال پتھر قدرتی پہاڑی پتھر ہیں۔دوم اس کے لگانے سے گرمی کی شرح تین درجے کم ہوجاتی ہے۔سوم یہ بہت خوبصورت لگتی ہیں۔یہ ادارہ خلیل احمد نینی تال والا ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ کے زیر اہتمام ہے۔جو بغیر کسی نفع نقصان کی بنیاد پر ہے جس کا تمام سرمایہ جو تقریباً بیس کروڑ روپے سے شروع کیا گیا ہے۔تمام کا تمام خلیل احمد نینی تال والا کی فیملی کا فراہم کردہ ہے۔اس میں کسی بھی سرکاری نیم سرکاری یا انفرادی ادارے سے عطیہ نہیں لیا گیا۔اور نہ ہی کسی بینک سے قرضہ لے کر بنایا گیا ہے۔یہ پاکستان کا خوبصورت ترین تعلیمی ادارہ ہے۔جو صرف اللہ کی رضا کے لئے بنایا گیا ہے۔اس کی آمدنی اس کے طالب علموں کی فیس اخراجات اور تعمیر نو کے لئے وقف کردی گئیں ہیں۔

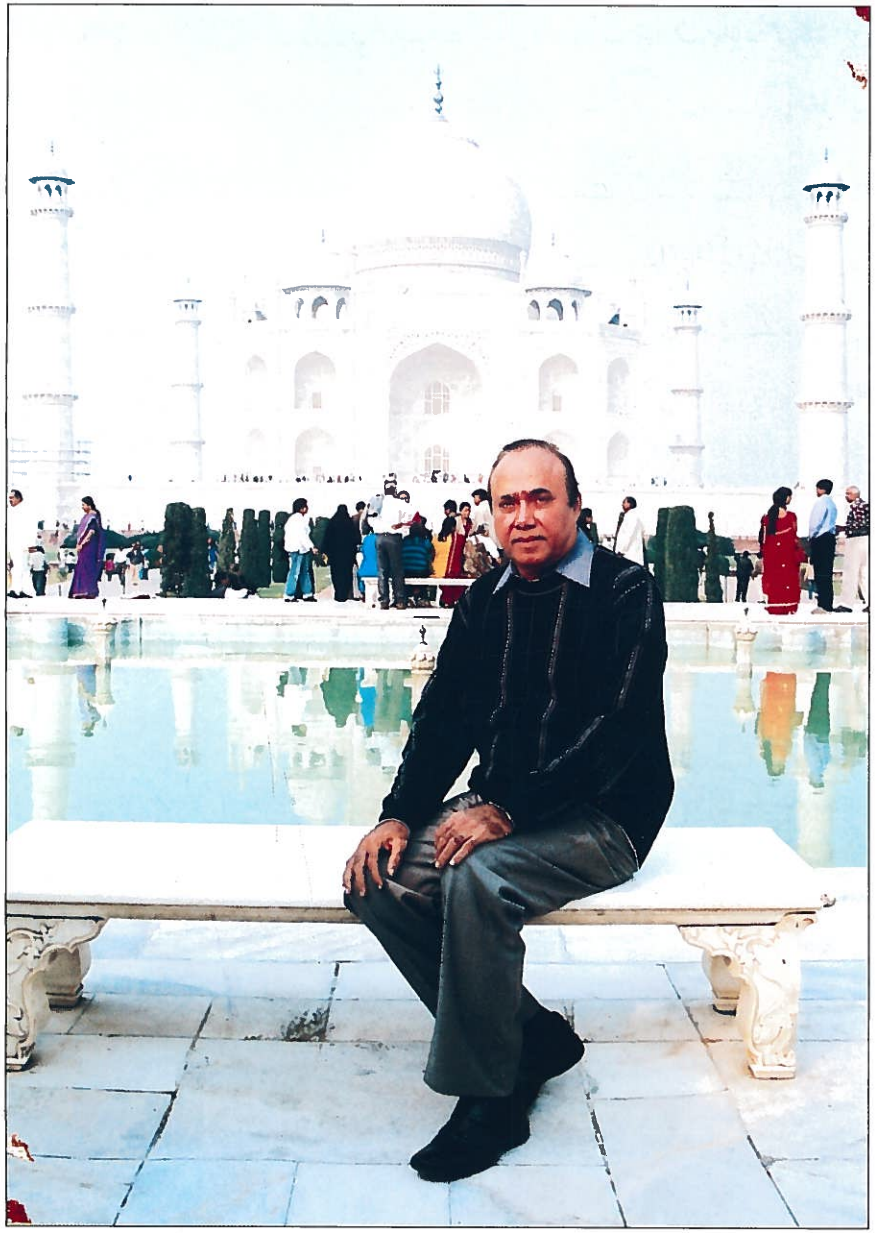

بھارت کا دورہ 2006ء تاج محل کے باہر

منٹوٹوتھ پیسٹ:۔ 2000ء میں پچ می کی طرف سے ایک نیا ٹوتھ پیسٹ متعارف کرایا۔جس کا نام پچ می منٹوٹوتھ پیسٹ تھا۔یہ پاکستان میں سب سے کم قیمت کا ٹوتھ پیسٹ صرف دس روپے میں متعارف کرایا۔یہ ایک انقلابی تجربہ تھا تاکہ عوام مارکیٹ کے بنے ہوئے عام ٹوتھ پاؤڈر کے بجائے جو دس روپے میں ملتے ہیں۔دس روپے میں ٹوتھ پیسٹ خریدیں اور معیاری (ہائی جینک) طریقہ سے دانت صاف کریں۔اگرچہ اس میں فی ٹیوب ایک روپے کا نقصان تھا۔مگر اس کے مستقبل میں عادی عوام سے آہستہ آہستہ قیمت بڑھا کر اس نقصان کو پورا کرنا تھا۔یعنی پہلے تین سال کا نقصان اگلے پانچ سال میں وصول کیا جانا تھا۔اس کے دو فائدے تھے۔ایک تو عوام غیر معیاری ٹوتھ پاؤڈر کو چھوڑ کر ٹوتھ پیسٹ کے عادی ہونگے۔دوسری طرف اُن کی جیب پر زیادہ بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔یہ تجربہ کافی کامیاب ہورہا ہے۔اس وقت منٹو اور نیچرل ٹوتھ پیسٹ دوسرے بننے والے 20 سال پرانے ٹوتھ پیسٹوں سے آگے نکل چکے ہیں۔اور دوسری طرف غیر ملکی کمپنیوں کو بھی کم دام کے ٹوتھ پیسٹ لانے پڑ رہے ہیں۔جو ہمارے عوام کے لئے مفید ثابت ہونگے۔2003ء میں پاکستان بھر سے تینوں کمپنیوں کے نمائندے جنہوں نے اپنے اپنے ٹارگٹ پورے کئے تھے۔اور اُن علاقوں کے ڈسٹری بیوٹر صاحبان کو مینڈوز اگروپ آف کمپنیز شیلڈ دے کر تقریباً 225 افراد کو دبئی میں سالانہ سیلز کانفرنس میں مدعو کیا۔جس کے اخراجات مینڈوز اگروپ آف کمپنیز نے برداشت کئے یہ چار روزہ کانفرنس بہت کامیاب ہوئی۔یہ پہلی پاکستانی کمپنی تھی۔جس نے اپنی سالانہ کانفرنس پاکستان سے باہر کی۔اس سے قبل آخری کانفرنس 1982ء میں ایبٹ آباد میں ہوئی تھی۔جس میں صرف 36 سیلز اور میڈیکل ریپرزنٹیٹو شامل تھے۔اس سے پاکستان میں مینڈوز اگروپ کی بہت رونمائی ہوئی۔اسکے بعد 2004ء میں دوسری سالانہ سیلز کانفرنس تھائی لینڈ کے شہر بنکاک میں مدعو کیا۔جس میں بھی 250 سے زائد افراد شریک ہوئے۔یہ بھی وہی افراد تھے جنہوں نے اپنی اپنی جگہ ٹارگٹ پورا کیا تھا۔انعامات کے علاوہ کافی

سوئیڈن کی کمپنی نارڈک کے ساتھ ٹوتھ پیسٹ کی آٹومیٹک مشین کے معاہدہ کے موقع پر

پروموشن کی گئی ۔اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے کمپنی نے 2005ء کے لئے ملیشیاء کے شہر کوالالمپور میں تیسری کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا۔جس میں 260 سے زائد افراد نے شرکت کی۔الحمدللہ ہر سال کمپنی کا ٹارگٹ 100 فیصد پورا ہوتا رہا2006ء کے لئے بھی دوبارہ تھائی لینڈ کے شہر پوکیٹ میں منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا ۔350 سے زائد افراد اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔انشاء اللہ ہر سال پاکستان سے باہر نیشنل سیلز کانفرنسیں منعقد کی جائیں گیں۔

کتنے ممالک میں سفر کیا :

اب تک الحمدللہ چار مرتبہ تو گلوبل سفر کر چکا ہوں ۔یعنی ایشیاء، یورپ، امریکہ، مشرقی بعید، مشرق وسطیٰ سے ہوتا ہوا واپس پاکستان آیا ہوں ۔مگر علیحدہ علیحدہ بھی سفر کئے ہیں ۔جن میں تھائی لینڈ، چین، ہانگ کانگ، ملیشیاء، انڈونیشیاء، تائیوان، جاپان، کوریا، امریکہ، برطانیہ، ہالینڈ، جرمنی، مصر، ہنگری، فرانس، ترکی، ایران افغانستان، بیلجیئم، سوئزرلینڈ، کنیڈا، صومالی لینڈ، بھارت، سری لنکا، مالدیپ، یو اے ای، سعودی عرب، بیروت، ڈنمارک، مونا کو، یونان، ایتھوپیا، اٹلی، ہالینڈ تقریباً دنیا کے تین سو سے زائد شہر دیکھے، تجارتی اور تفریحی دورے کئے ۔اپنی تمام فیملی جن میں بیگم کے ساتھ تینوں بیٹوں سلمان خلیل، خرم خلیل، جنید خلیل کے علاوہ اپنی بیٹی صبوحی خلیل کو بیشتر ممالک کی سیر کرائی ۔جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔کہ پہلے بیشتر ممالک میں ویزے نہیں تھے۔لہذا سفر آسان تھا اب صرف دو تین ممالک رہ گئے ہیں ۔جہاں پاکستانیوں کے لئے ویزے نہیں ہیں اور 9/11 کے بعد تو پاکستانیوں کے لئے ویزوں کا حصول بہت ہی دشوار ہو گیا ہے۔اس وجہ سے بھی فیملی کے ساتھ سفر اب بہت ہی کم رہ گیا ہے۔پھر بھی دس پاسپورٹ بھر چکے ہیں ۔باوجود اس امر کہ 1980ء تک تو بیشتر ممالک میں ویزے ہی نہیں تھے۔لہذا وہ مہر بھی نہیں لگاتے تھے۔اگر 1967ء سے مہریں لگتیں تو شاید دس پاسپورٹ مزید بھر چکے

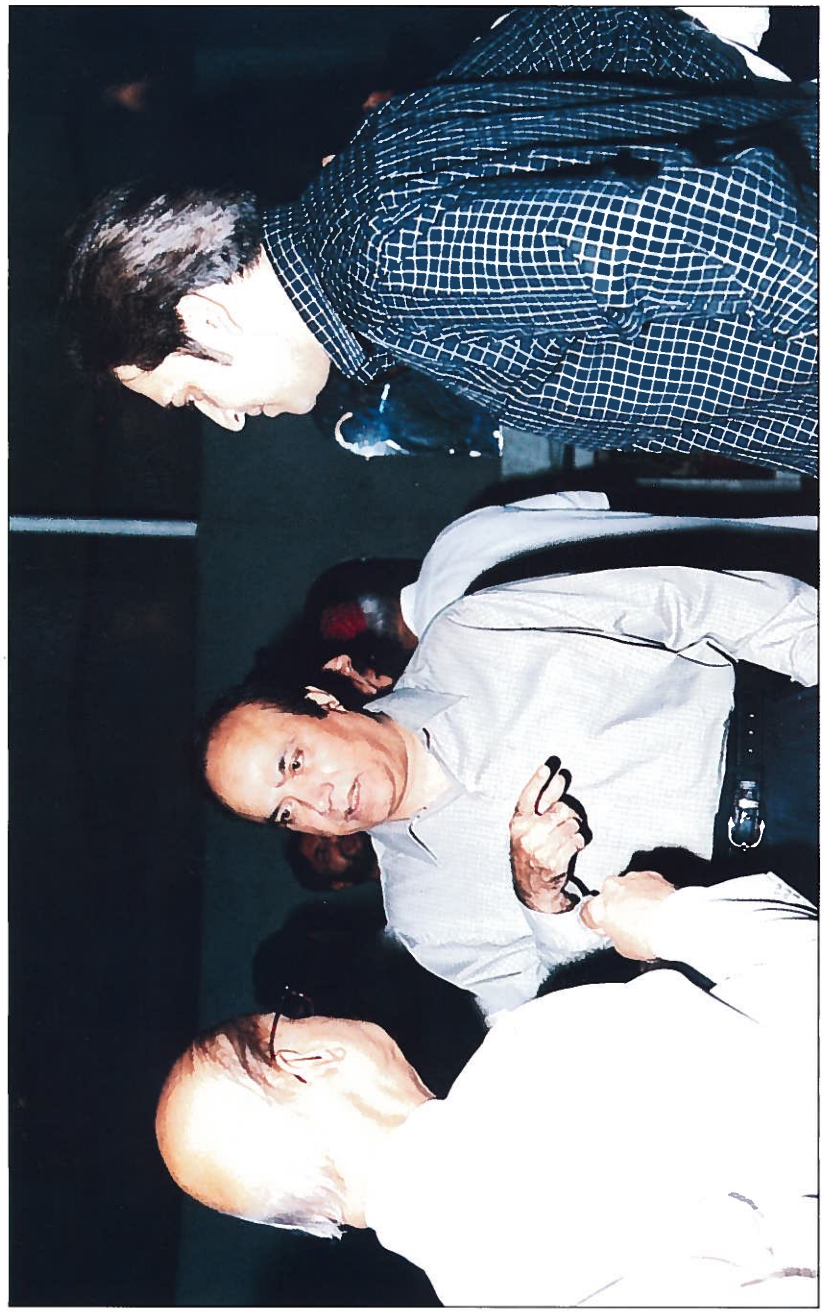

عبداللہ قادوانی، نبیل احمد کے ساتھ ایک تقریب میں

ہوتے۔

سب سے پہلا ہوائی سفر:

1964ء میں سب سے پہلا ہوائی سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔میری عمر صرف 20 سال کی تھی۔کاروبار کے سلسلے میں کراچی سے لاہور بذریعہ ٹرین پہنچا تو معلوم ہوا کہ کراچی میں انفلوئینزا پھیل گیا ہے۔ انفلوئینزا کی دوائی کوئٹہ میں دستیاب ہے۔لاہور سے کوئٹہ بذریعہ ٹرین تقریباً 30 گھنٹے کا سفر تھا۔ سوچا کہ ہوائی جہاز سے روانہ ہوا جائے۔تاکہ کوئی اور یہ مال نہ خرید لے۔پی آئی اے کا جہاز جس کا نام سپر کانسی لیشن تھا تقریباً 36 سیٹ کا چھوٹا جہاز تھا۔صبح صبح روانہ ہونا تھا۔اُس کا ٹکٹ خریدا ٹکٹ 120 روپے کا تھا۔چونکہ پہلا ہوائی سفر تھا۔لہذا رات بھر نیند نہیں آئی، کچھ گھبراہٹ اور کچھ خوشی کی وجہ سے صبح 7 بجے فلائٹ تھی ہوٹل سے صبح 5 بجے روانہ ہوئے۔اُس زمانے میں پی آئی اے لاہور کا دفتر مال روڈ پر تھا وہیں سے بس مسافروں کو لے کر ایئرپورٹ جاتی تھی۔لہذا پی آئی اے کے دفتر پہنچے وہاں سے بریفنگ کروا کر ائرپورٹ پہنچے۔لاہور سے کوئٹہ کا سفر تقریباً 1½ گھنٹے کا تھا۔راستہ بھر دل دھڑکتا رہا یہاں تک کہ ہم کوئٹہ ایئرپورٹ پہنچے بہت چھوٹا سا ایئرپورٹ تھا۔پی آئی اے کی ہی گاڑی سے کوئٹہ شہر پہنچے۔بہت صاف ستھرا شہر تھا۔بہت پسند آیا۔واپسی بھی پی آئی اے سے تھی۔مگر مشکل یہ ہوئی کہ واپسی کا جہاز بذریعہ ملتان تھا۔اور سیٹ ملتان تک مل رہی تھی۔ملتان سے لاہور جہاز فُل تھا، بادل نخواستہ کوئٹہ ملتان ٹکٹ لیا۔جو 90 روپے تھا جب جہاز ملتان کے نزدیک پہنچا تو ملتان کا موسم خراب ہوگیا جہاز ملتان اترے بغیر لاہور چلا گیا ہم کو تو لاہور ہی جانا تھا۔بہرحال جب لاہور ائرپورٹ پہ اترے تو پی آئی اے کے عملے نے کہا ملتان جانے والے مسافر الگ کاؤنٹر پر آجائیں۔ہم اور پندرہ مسافر الگ کاؤنٹر پر آگئے۔ان مسافروں کو پی آئی اے کی طرف سے لاہور میں ایک رات

اشتیاق بیگ کتاب شگوفہ نو کی تقریب رونمائی میں اہلیہ ھمیرا خلیل

پہلی کتاب شگوفۂ نو کی تقریب رونمائی سے پہلے معین الدین حیدر کے ساتھ

ٹھہرانے کا بندوبست انٹرنیشنل ہوٹل جو نیا نیا بنا تھا ٹھہرایا گیا۔ میں بھی ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ رات کا کھانا دوسرے دن کا ناشتہ بھی پی آئی اے کی طرف سے تھا۔ سوچا ملتان کی مفت سیر کر لی جائے۔ پھر دوپہر فلائٹ تھی ایئرپورٹ پہنچے تو معلوم ہوا صرف پانچ سیٹیں خالی ہیں ہم سولہ مسافر تھے۔ گیارہ مسافروں کو پی آئی اے نے پچاس روپے فی کس نقد ادا کر دیئے کہ وہ چاہیں تو بذریعہ ٹرین فرسٹ کلاس میں جا سکتے ہیں۔ ہم نے بھی پچاس روپے نقد وصول کئے اور لاہور ہی میں رک گئے اس طرح صرف چالیس روپے میں یہ کوئٹہ لاہور کا ٹکٹ پڑا اور ایک رات فائیو سٹار ہوٹل میں بھی ٹھہرا۔ ایسا نایاب سفر ایک یادگار ثابت ہوا۔ یعنی لاہور کوئٹہ کا کرایہ صرف 40 روپے میں ہو گیا۔

سب سے پہلا مشرقی پاکستان کا سفر:

1966ء میں سب سے پہلا سفر کراچی سے مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ سفر بھی تجارتی سفر تھا۔ ڈھاکہ بھی بہت صاف ستھرا شہر تھا۔ خاص طور پر موتی جھیل کا علاقہ کمرشل ایریا تھا۔ یہاں بارشیں بہت ہوتی تھیں۔ یعنی مغربی پاکستان کے برعکس جہاں کبھی کبھی بارشیں ہوتی ہیں۔ یہاں تقریباً روز ہی بارش ہوتی تھی۔ پہلے تو بہت مزا آیا مگر جب روز ہی روز بارش ہو تو کام کیسے ہوتا آئے دن ہڑتالیں کرنا اُن کا مسئلہ تھا۔ دو فیصد غیر بنگالی لوگ تھے جن میں مغربی پاکستان کے اور بھارت سے ہجرت کرنے والے اُردو اسپیکنگ تھے جنہیں عرف عام میں بہاری کہا جاتا تھا۔ یعنی غیر بنگالی خواہ وہ مہاجر ہو، پنجابی یا پٹھان ہو بہاری سمجھا اور کہا جاتا تھا۔ کاروبار انہی دو فیصد افراد کے پاس تھا یا پھر ہندو بنیوں کے پاس تھا۔ 90 فیصد عوام انتہائی غربت کی زندگی گزارتے تھے۔ مشرقی پاکستان بار بار تجارت کیلئے آتا جاتا رہا۔ 1969ء سے بہاریوں اور بنگالیوں میں کشیدگی شروع ہو چکی تھی۔ خصوصاً سیاست دانوں کی چپقلش اور مجیب الرحمان کی اگرتلہ سازش کیس کے بعد سے بنگالی مسلمان ہندو بنگالیوں کی

بحیثیت مشیر اطلاعات سندھ پہلی پریس کانفرنس کے موقع پر

باتوں میں آ کر مغربی پاکستانیوں کے خلاف ہو رہے تھے۔ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے چونکہ مشرقی پاکستان میں ایک سیٹ کے علاوہ تمام پر کامیابی حاصل کر لی تھی اس لئے اب وہ حکومت بنانے کی پوزیشن میں آ چکے تھے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری تھی۔ اس لئے وہ حکومت بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صدر یحیٰی خان نے 3 مارچ 1971ء کو اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا تھا۔ اتفاق میں 3 مارچ کو ڈھاکہ میں تھا۔ کہ یکا یک ایک بجے کے قریب عوام سڑکوں پر نکل آئے اور حکومت کے خلاف نعرے بازی کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام بازار بند ہو گئے میں اُس وقت موتی جھیل میں پی آئی اے کے دفتر میں تھا۔ کہ پی آئی اے کے دفتر میں دونوں شٹر گرا کر ہم اندر ہی بیٹھے رہے۔ یکا یک شٹروں پر پتھروں کی بارش ہوگئی بہ مشکل تمام پچھلے راستے سے ہم جان بچا کر نکلے اور سیدھے ہوٹل کی راہ لی۔ یحیٰی خان نے دراصل بغیر کسی صلح مشورہ کئے 3 مارچ کا اسمبلی اجلاس غیر معینہ مدت کیلئے ملتوی کر دیا تھا۔ جو مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کو منظور نہیں تھا۔ لہذا اُس نے ہڑتال کی کال دی اور یہ مؤثر ترین ہڑتال ثابت ہوئی جس سے عوامی لیگیوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ اب وہ عوام کو بغاوت پر اُکسا رہے تھے۔ اسٹوڈنٹس تنظیمیں مزدور تنظیمیں مکتی باہنی سب مل کر اُن کا ساتھ دے رہے تھے۔ 23 مارچ کو پاکستان کا جھنڈا جلایا گیا۔ اور پہلی مرتبہ بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ مجبوراً مغربی پاکستان سے فوج منگوا کر اس کے خلاف فوجی آپریشن کیا گیا۔ لاکھوں ہندو مشرقی پاکستان سے بھاگ کر بھارت میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ کاروبار ٹھپ پڑ گئے۔ میں نے جو کمپنی میڈیسن سپلائی ایجنسی چٹاگانگ میں 1967ء میں خریدی تھی۔ مجھے مجبوراً چھوڑ کر کراچی آنا پڑا۔ بہت سے اُردو بولنے والے مارے گئے زیادہ افراد کو نقصان پہنچایا گیا۔ جون میں جا کر کچھ امن ہوا۔ واپس چٹاگانگ گیا ہندو ڈرے ہوئے تھے مگر حالات بدستور خراب تھے۔ یہاں تک کہ بھارت نے نومبر 1971ء میں چٹاگانگ ڈھاکہ پر فضائی حملہ شروع کر دیا اور اب مشرقی پاکستان میں دست بہ

2002ء سوات میں دوستوں کے ساتھ گروپ فوٹو

دست لڑائی شروع ہوگئی۔ اور اس طرح 16 دسمبر کو ڈھاکہ خالی ہوگیا۔ اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ اُس زمانے کے حساب سے تقریباً چار لاکھ کا نقصان ہوا۔ کیونکہ میڈیسن سپلائی ایجنسی میں اتنی ہی مالیت کا مال رکھا ہوا تھا۔ جو وہیں رہ گیا خوش قسمتی سے ہم سب لوگ مغربی پاکستان میں تھے۔ لہٰذا جانی نقصان نہیں ہوا۔ یہ بھی اللہ کا بہت شکر تھا کہ ہم سب لوگ رمضان المبارک کی بدولت بچ گئے۔ بہت دُکھ ہوا کہ ہمارا ملک بھارت نے دولخت کر دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پہلا غیر ملکی ہوائی سفر ہانگ کانگ بذریعہ چائنا:

18 مارچ 1967ء کو پہلا غیر ملکی سفر کیا کراچی سے ہانگ کانگ جانے کے لئے پی آئی اے کے جہاز سے کینٹن پہنچے کیونکہ کراچی سے ڈائریکٹ کوئی فلائٹ ہانگ کانگ نہیں جاتی تھی۔ یہ میرا پہلا غیر ملکی سفر تھا۔ عمر بھی صرف 23 سال تھی۔ چائنا پہنچا ایک رات پی آئی اے نے کینٹن میں ایک ہوٹل میں ٹھہرایا 800 کمرے کا بہت بڑا ہوٹل تھا۔ اور ہم صرف پچاس مسافر تھے۔ سارا ہوٹل خالی تھا۔ بہت بڑے بڑے کمرے تھے۔ ان میں لاک سسٹم نہیں تھا صرف اندر سے آپ چٹخنی لگا سکتے تھے۔ چینی عملہ ایک لفظ بھی انگریزی سے واقف نہیں تھا۔ ریسٹورنٹ میں بھی ہم ہی لوگ ہوتے تھے۔ پی آئی اے کا عملہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بڑی بڑی سڑکوں پہ صرف سائیکل سوار نظر آتے تھے۔ کسی کا کوئی ذاتی کاروبار نہیں تھا۔ سب کمیونسٹ پارٹی کا راج تھا۔ ہر دیوار ہر چوراہے ہر بس ٹرین سب جگہ ماؤزے تنگ کی تصویریں تھیں۔ حتٰی کہ وہاں حضور ﷺ کے صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص کا مزار تھا۔ وہاں بھی ماؤ کی تصویر کندہ تھی۔ دوسرے دن ٹرین سے ہانگ کانگ پہنچے بہت خوبصورت شہر تھا بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ ان دنوں ہانگ کانگ ڈالر ہم سے بھی سستا تھا۔ یعنی 62 پیسے میں ایک ہانگ کانگ ڈالر تھا۔ جو آج تقریباً 8 روپے کا ہو چکا ہے۔ صرف پانچ دن قیام کیا جو مال خرید

تاج محل کی سیر کے دوران دوستوں کے ساتھ

نا تھا۔ وہ بُک کرایا۔ ایک فارماسیوٹیکل کمپنی کو بہت بڑا آرڈر دیا۔ جس سے کافی منافع ہوا۔ دوسری ٹرین سے پانچ دن بعد پھر کینٹن جانا پڑا۔ کیونکہ آنے جانے کے لئے صرف چائنا ہی ایک راستہ تھا۔ کینٹن سے 24 مارچ کو واپس کراچی بہ راستہ ڈھاکہ پہنچے خوب سیر کی اور خوب شاپنگ کی کیونکہ ہانگ کانگ کراچی کی نسبت بہت سستا ملک تھا۔ جہاں دنیا جہان کی چیزیں بہت ارزاں ملتی تھی۔ خاص طور پر کپڑے، پرفیوم، کاسمیٹکس بہت سستا تھا۔ اسی طرح الیکٹرانک کے آئٹم بھی بہت سستے تھے۔ ریڈیو، ٹی وی، گھڑیاں سب ہی سستی تھیں۔ کیونکہ ہانگ کانگ ڈیوٹی فری ملک تھا۔ اس وجہ سے یہاں ایشائی باشندے شاپنگ کے لئے آتے تھے۔ کوئی ویزہ نہیں تھا۔ بڑے بڑے ہوٹل کیسینو بڑی بڑی عمارتیں تجارتی مراکز تھے۔ عوام چینی بولتے تھے۔ اس سے ملا ہوا ایک جزیرہ تھا۔ اُس کا نام مکاؤ تھا یہ پرتگیزیوں کی کالونی سمجھی جاتی تھی۔ جس طرح ہانگ کانگ برطانیہ کی کالونی تھا۔ مکاؤ میں 90 فیصد صرف کیسینو تھے۔ یہی اس کا ذریعہ معاش تھا۔ یہاں بلی کتوں مرغوں کی بھی ریس ہوتی تھی۔ ہر گلی جوئے خانے اور ریسٹورنٹوں ہوٹلوں سے بھری ہوتی تھیں۔ یہ بھی بہت خوبصورت شہر تھا۔ جس میں چینی بولی جاتی تھی۔ عیاشیوں کے اڈے عام تھے۔ اسی وجہ سے ٹورسٹ بھرے رہتے تھے۔ جس فارماسیوٹیکل کمپنی سے ہم نے تجارت کی اور کافی آرڈر دیئے ایک دن اُس کی فیکٹری بغیر اُس کو بتائے (کیونکہ ہم نے یہ پتہ ٹیلیفون ڈائریکٹری سے لیا تھا) وہاں پہنچ گیا وہ حیران رہ گیا وہ ایک انڈسٹریل بلڈنگ تھی۔ اور اُس میں ایسی 5 فیکٹریاں کام کر رہی تھیں۔ جو کسی بھی طرح سے فارماسیوٹیکل فیکٹری کہلانے کی مستحق نہیں تھی۔

جاپان :

1968ء میں جاپان کا تجارتی دورہ کیا۔ بہت خوبصورت شہر ٹوکیو میں پہلی مرتبہ گیا۔ بہت نفیس لوگ

فرانس سے آتے ہوئے V-MANE FILS کے مالکان اور افسران کے تجارتی کونسل کی افطار ڈنر پارٹی کے موقع پر

ہوتے ہیں۔ بہت پڑھے لکھے خاموش طبیعت انتہائی مہنگا ملک تھا۔ ایک ڈالر میں 500 ین ملتے تھے۔ ایک وقت کا کھانا اُس زمانے میں 25 ڈالر میں اور کمرہ 150 ڈالر میں ملتا تھا۔ جاپانی دوستوں کے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بہت صاف ستھرا چھوٹا گھر زمین پر چٹائیاں ہوتی ہیں۔ جوتے چپل باہر ہی اتارتے ہیں۔ 18 گھنٹے کام کرتے ہیں۔ شہر سے باہر رہتے ہیں۔ کیونکہ ٹوکیو دنیا میں سب سے زیادہ مہنگے شہروں میں دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ یہاں مذاق میں لوگ کہتے ہیں کہ امریکہ میں رات ہوتے ہی عوام کو لوٹا جاتا ہے۔ اور جاپان میں صبح ہوتے ہی لوٹنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ اس سے مراد جاپان کی مہنگائی کی طرف ہے۔ جاپان میں دو واقعات پیش آئے۔ اتفاق سے پاسپورٹ کی مدت ختم ہو رہی تھی اور امریکہ جانا تھا تو ہم پاکستان ایمبیسی پہنچے، بہت دکھ ہوا یہ دیکھ کر کہ ایمبیسڈر صاحب کا مکان تو بہت خوبصورت تھا مگر ایمبیسی بہت ہی تھرڈ کلاس تھی۔ ہم نے ایمبسڈر سے ملاقات کا وقت مانگا۔ بڑی مشکل سے پاکستان ایمبیسی کا عملہ راضی ہوا۔ جب ایمبیسڈر صاحب سے دفتر اور رہائش گاہ کے فرق پر بحث کی تو ہمارے ایمبیسڈر ناراض ہو گئے پوچھنے لگے آپ کس لئے آئے تھے ہم نے بتایا کہ ہم آئے تو پاسپورٹ کی تجدید کروانے تھے مگر ایمبیسی کی ٹوٹ پھوٹ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہنے لگے ہم دو برس سے حکومت سے فنڈ مانگ رہے ہیں۔ مگر فنڈ نہیں مل رہا ہے۔ میں نے اعتراض کیا کہ جب فنڈ ملے تھے تو پہلے رہائش گاہ کے بجائے دفتر کو درست کرنا چاہئے تھا۔ ایمبیسڈر صاحب نے آئیں بائیں شائیں کی پھر بولے جناب آپ پاسپورٹ کی تجدید کرالیں اور ہمیں معاف کریں۔ اُس زمانے میں پاسپورٹ پر حج کے زمانے میں سعودی عرب پر پابندی کی مہر لگائی جاتی تھی۔ میں نے کہا کہ نئے پاسپورٹ میں یہ مہر نہ لگائیں تو مہربانی ہوگی بادلِ ناخواستہ ایمبیسڈر صاحب نے یہ مہر لگانے سے منع کر دیا تاکہ میں حج کے لئے جاسکوں۔ مگر افسوس کہ میں حج اور عمرہ کیلئے نہیں جاسکا۔ ان کی یہ مہربانی بھی بے کار گئی۔ کیونکہ لندن میں سعودی ایمبیسی ویزہ لینے گئے تو شاہ خالد کے انتقال کی وجہ سے ایمبیسی بند

خلیل احمد نینی تال والا نے ایران کے کونسل جنرل کو ظہرانہ دیا محمود شام نمایاں ہیں

تھی ۔جاپان بھی تقریباً سال میں دو تین تجارتی دورے ہوتے تھے ۔دوسرا اہم واقعہ امریکن ایمبیسی میں پیش آیا۔ یہ بھی ٹوکیو میں امریکن ایمبیسی گیا تا کہ وہاں سے امریکہ کا ویزہ لے کر جاؤں کیونکہ اتفاق سے ٹوکیو میں ایک امریکن کمپنی جس کا نام کریمر اربن کارپوریشن تھا۔اُس کی ایجنسی ہم نے چاس اے مینڈوزا کے ساتھ خریدی تھی ۔اس نے امریکہ آنے کی دعوت دی ہم چونکہ کراچی سے ٹوکیو آچکے تھے لہذا وہ دعوت نامہ ہم کو بذریعہ فیکس ٹوکیو میں ملا ہم اس فیکس کو لے کر امریکن ایمبیسی گئے ۔امریکن کونسل نے صرف اس وجہ سے کہ ہم بار بار چائنا جاتے رہے ہیں ۔ویزہ دینے سے انکار کر دیا۔اور پاسپورٹ کو کاؤنٹر سے جان بوجھ کر نیچے گرادیا۔ہم نے بہت بُرا مانا ایک تو اُس نے ویزہ دینے سے انکار کیا اور دوسرا ہمارے پاسپورٹ کی توہین کی ۔جس کا ہم نے احتجاج کیا اور کہا کہ ہم اُس کے کونسل جنرل سے ملنا چاہتے ہیں ۔ پہلے تو اُس نے ٹالا مگر ہم بھی اڑے رہے تب جا کر اُس نے کونسل جنرل سے ملنے کا وقت لے کر دیا۔ساراد ن ہم ایمبیسی کے باہر بیٹھے رہے کیونکہ وقت شام تین بجے کا تھا۔اور ہم صبح گیارہ بجے پہنچے تھے ۔اللہ اللہ کر کے شام تین بجے ہم کونسل جنرل سے ملنے اُس کے کمرے میں گئے اُس سے شکایت کی کہ ہمارے ساتھ پاسپورٹ کی بے عزتی کا واقعہ جان بوجھ کر کیا گیا ہے ۔جس کا اُس نے بھی نوٹس لیا اور اُس کونسل کو بلوایا اُس نے کہا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا اُس نے معذرت کی اور پوچھا کہ آپ امریکہ کیوں جانا چاہتے ہیں ۔میں نے وہ دعوت نامہ نکال کر دکھایا اُس نے پوچھا کہ آپ چائنا کیوں جاتے رہے ہیں ۔میں نے اُس کی وجہ بتائی کہ وہاں کیمیکل اور دیگر ادویات امریکہ کی نسبت سستی ہیں ۔اس لئے ہم وہاں جاتے رہے ہیں ۔اس نے ہم سے کافی سوالات اور کئے اور ہمیں امریکہ کا ویزہ دے دیا۔اور کہا کہ آپ پہلے پاکستانی ہیں جنہیں پاکستان کے باہر امریکہ کا ویزہ مل رہا ہے ۔خاص طور جو بار بار چائنا کا دورہ بھی کرتا رہا ہو۔خیر وہاں سے بھی کامیاب واپس لوٹا اور پھر ٹوکیو سے امریکہ روانہ ہو گیا۔

مینڈوزا کی افطار پارٹی میں شرکاء کے ساتھ شریک

امریکہ کا پہلا سفر:

پاسپورٹ پر امریکہ کا ویزہ ملا جو C.1 تھا۔یعنی صرف ایک وزٹ کا ویزہ تھا تیس دن کی اجازت تھی کہ ہم وہاں گھوم پھر سکیں ۔چونکہ کاروباری دعوت ملی تھی۔لہذا شگاگو کے پاس ایک دوسرا شہر ملوا کی جانا تھا۔وہاں اُس امریکن کمپنی کریمر اربن انٹرنیشنل جس کا لوگو یعنی مونوگرام کے یو کے نام سے مشہور ادویات سازی کا مرکزی دفتر تھا۔اس کمپنی کی مارکیٹنگ چاس اے مینڈوزا جو کمپنی ہم نے 1967ء میں خریدی تھی وہی پاکستان میں کرتی تھی۔درمیانی قسم کی کمپنی تھی ۔نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی البتہ دنیا کے بیشتر ممالک میں اس کمپنی کی ادویات ایکسپورٹ ہوتی تھیں ۔شربت،کیپسول،گولیاں انجکشن کے آٹومیٹک پلانٹ لگے ہوئے تھے۔تمام ادویات چھوٹی پیکنگ میں یہ ایکسپورٹ کرتے تھے۔جس کی وجہ سے کافی مہنگی ثابت ہوتی تھی۔لہذا میرا موقف یہ تھا کہ ہم بلک (Bulk) پیک یعنی ہزار ہزار گولیوں ،کیپسولوں کی پیکنگ کروا کر یہاں پاکستان میں (Repack) دوبارہ چھوٹی پیکنگ میں کریں اسی طرح شربت کے گیلن پیک امپورٹ کر کے ہم چھوٹی بوتلوں میں دوبارہ پیک کریں تو کافی قیمتوں میں کمی ہوسکتی ہے ۔کئی روز تک میٹنگیں چلتی رہیں کیونکہ اس کمپنی نے ابھی تک بلک سپلائی کا سوچا تک نہیں تھا۔بہرحال پانچویں دن میں اُن کو بلک پیکنگ منظور کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ ماضی میں چاس اے مینڈوزا کے پہلے مالکان نے سالانہ جتنا مال امپورٹ کیا تھا اُس سے کم از کم دوگنا مال میں بلک میں امپورٹ کروں گا۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دوسرے سال پانچ گنا مال امپورٹ ہوگیا۔تو میں دوبارہ امریکہ گیا اب کے میں نے پاکستان سے پانچ سال کا B.1 ویزہ لیا تھا۔دوسرے سال میں نے اُن کا مال پاکستان میں مینوفیکچر کرنے کی اجازت مانگی تا کہ قیمت اور کم ہوسکے ۔انہوں نے ایک امریکن کمپنی کی معرفت کیپسول اور ٹیبلیٹ بنوانے کی اجازت دے دی۔ 1972ء میں انہوں نے ہماری کمپنی کو بھی مال بنانے کی اجازت دے دی کیونکہ اب وہ ہم سے کافی

فرانس کے کمرشل کونسل اور وی مین فلز کے جون مین کے ساتھ۔

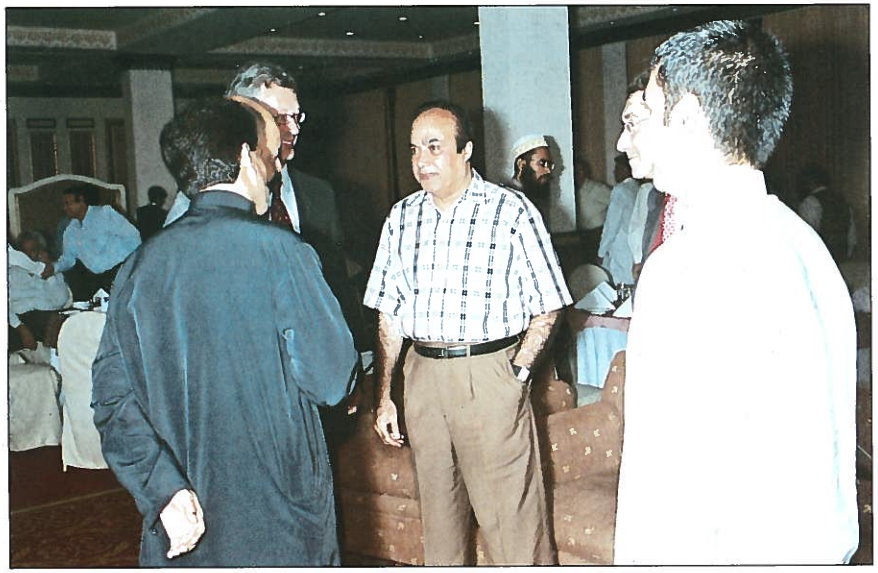

فرانس کے وفد کے اراکین کے ساتھ فوٹو

مطمئن ہو چکے تھے۔ بدقسمتی سے 1973ء میں وزارت صحت نے ڈرگ ایکٹ 1953ء منسوخ کر کے جینرک ایکٹ 1973ء نافذ کر دیا جس کی رو سے اب ادویات صرف جینرک نام سے بنیں گی۔ بیشتر غیر ملکی کمپنیوں نے جینرک نام سے ادویات بنانے سے انکار کر دیا اور اپنی فیکٹریاں بند کر دیں۔ اُس کا فائدہ مقامی کمپنیوں کو ہوا۔ اسی طرح اس امریکن کمپنی نے بھی جینرک ایکٹ کے تحت مال بنانا بند کر دیا۔ مگر اُس وقت تک الحمدللہ چاس اے مینڈوزا نے اپنی ادویات اور KU کی ادویات جنرک نام سے رجسٹرڈ کروا کر بنانے کی اجازت لی تھی تو اب تمام مال مینڈوزا فیکٹری میں بننا شروع ہو گیا اور اُس امریکن کمپنی سے معاہدہ ختم کرنا پڑا۔ جب سے آج تک مینڈوزا کی ادویات تمام پاکستان میں فروخت ہوتی ہیں۔ اس کے بعد بھی امریکہ جاتا رہا۔ مگر 1967ء میں جب ملوا کی سے پہلی مرتبہ نیویارک گیا تو KU کے چیئرمین نے خصوصی طور پر مجھے ڈنر پر مدعو کیا اور کہا کہ تم پہلی مرتبہ نیویارک جا رہے ہو۔ اپنا خیال رکھنا رات دیر تک باہر نہ رہنا نہ دس بجے کے بعد انڈر گراؤنڈ ٹرین میں سفر کرنا، کوشش کرنا کہ اکیلے گھومنے کے بجائے دوستوں کے ساتھ گھومنا۔ کیونکہ عموماً یہ کالے امریکن غیر ملکیوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ خاص طور پر جیب میں ہمیشہ 50 سے سو ڈالر تک ضرور رکھنا۔ زیادہ بھی نہیں رکھنا۔ اُس زمانے میں کوئی کریڈٹ کارڈ کا پاکستان میں سسٹم نہیں تھا۔ بلکہ ٹریولر چیک یا نقد کا رواج تھا آج بھی مجھے اُس کی اس نصیحت پر بڑا تعجب ہوا تھا کہ ہم تو پاکستان کو نسبتاً کم محفوظ سمجھتے تھے یہاں تو دنیا کا سب سے بڑا سپر پاور ملک خود امریکہ غیر محفوظ تھا۔ کم از کم کراچی میں تو رات گئے تک لوگ گھومتے پھرتے تھے۔ یہ نیویارک جس کا بڑا چرچا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اتنا غیر محفوظ ہو سکتا تھا۔ یعنی 40 سال قبل امریکہ کے شہر غیر محفوظ تھے۔ مگر آج بالکل اس کے برعکس ہو چکا ہے کراچی غیر محفوظ ہو چکا ہے اور نیویارک میں آپ آزادی سے گھوم سکتے ہیں۔ ایک شام 6 بجے نیویارک میں اچانک بجلی چلی گئی میں 17 ویں فلور پر ٹھہرا ہوا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ میرا ہوٹل بھی مین ہٹن

تحریکِ استقلال کے جلسے کے موقع پر 1985ء صدارت کر رہے ہیں۔

پر واقع تھا۔ جوں جوں رات بڑھتی جارہی تھی براڈوے ڈراؤنا ہوتا جارہا تھا۔ پھر اچانک دوکانوں کے شٹر ٹوٹنا شروع ہوگئے۔ ہوٹل کے مین گیٹ پر سیکورٹی والے آگئے اور صرف ہوٹل میں ٹھہرے مسافروں کو رُکنے کی اجازت تھی۔ لفٹ بند ہوچکی تھی باہر جانا خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ رات بھر ہوٹل میں جو بھی سامان تھا۔ پانی، کولڈ ڈرنک سب ختم ہوچکا تھا۔ باتھ روم میں پانی نہیں آرہا تھا۔ نلوں میں بھی پانی ختم ہوچکا تھا صبح منرل واٹر سے کام چلایا دوسرے دن پولیس نے کالوں اور لوٹنے والوں کو قابو کیا۔ پولیس اسٹیشن بھر گئے۔ حتٰی کہ ان مجرموں کو جو دوکانیں لوٹ رہے تھے۔ پکڑ پکڑ کر اسکولوں کی عمارتوں میں بند کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بہت سی لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کالوں نے زیادتی کی۔ میری فلائٹ دوسرے دن تھی میں دوپہر بہ مشکل ایئرپورٹ پہنچا۔ اُس وقت تک ائیر پورٹ پر ایمرجنسی لائٹ کام کررہی تھی پھر نیویارک کی بجلی بھی جزوی طور پر بحال ہوچکی تھی میں جہاز سے بیلجیئم روانہ ہوگیا۔ بار بار امریکہ جانے کا اتفاق رہا۔ بہت شہر گھومے جن میں شگاگو، ملواکی، نیویارک، اور لینڈو، لاس ویگاس، ڈیلاس، نیوجرسی، فی نیکس، میامی، ڈزنی ورلڈ، واشنگٹن، فلوریڈا قابل ذکر ہیں۔

برطانیہ کا پہلا سفر:

پاکستان سے پہلی مرتبہ کراچی ائرپورٹ سے پی آئی اے کے ذریعہ لندن روانہ ہوا۔ 1968ء ماہ جون یا جولائی کا مہینہ تھا۔ لندن ایئرپورٹ پر اترا بہت سردی تھی۔ اُس زمانے میں برطانیہ کا ویزہ ایئرپورٹ پر ہی مل جاتا تھا۔ سامان کلیئر کروا کر باہر آیا سردی سے دانت بج رہے تھے۔ ایک پاکستانی جن کا نام اب یاد نہیں رہا میرے پاس آئے پوچھا کیا پہلی مرتبہ لندن آنا ہوا ہے۔ میں نے جواب دیا جی ہاں پہلی مرتبہ آیا ہوں پوچھا کہاں ٹھہروگے میں نے بتایا سنٹرل لندن میں کسی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہروں گا۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ آپ نئے ہو اگر آپ چاہیں تو میرا غریب خانہ حاضر ہے مگر وہ لندن سے ذرا

میر خلیل الرحمان کے ساتھ

باہر ہے۔اُس جگہ کا نام اسٹیرٹنگ کامن ہے وہاں ٹیوب اسٹیشن تو نہیں ہے مگر ہر آدھے گھنٹے کے بعد ٹرین لندن آتی جاتی ہے۔ہم نے لندن ایئرپورٹ سے شہر جانے والی بس لی جس کا کرایہ صرف ½2 پونڈ تھا۔اُس زمانے میں 10 روپے کا پونڈ آتا تھا۔اگر ٹیکسی لیتے تو کم از کم 5 پونڈ لگتے تھے۔ہم دونوں نے بس کا ٹکٹ لیا۔پیسے بھی اُس اللہ کے نیک بندے نے دیئے۔سنٹرل لندن میں وکٹوریہ آخری اسٹاپ تھا۔وہاں ہم اتر گئے۔وکٹوریہ بس اسٹینڈ کے اندر ہی وکٹوریہ ریلوے اسٹیشن اور وکٹوریہ ٹیوب اسٹیشن تھا۔ٹیوب اسٹیشن لندن کی زبان میں زمین دوز ٹرینوں کو کہتے ہیں جو تمام لندن میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتی ہیں۔میں چونکہ بالکل واقف نہیں تھا،لہذا اُن کی مہمان داری قبول کرلی۔ٹرین سے ہم دونوں اسٹیرٹنگ کامن پہنچ گئے۔اُن کا گھر اسٹیشن کے سامنے ہی گلی میں تھا۔پیدل ہم سامان اُٹھا کر گھر پہنچ گئے۔اُن کے مکان میں ایک کمرہ اور ڈرائنگ روم نیچے تھا۔اوپر اُن کی فیملی رہتی تھی۔لندن کا ٹائم پاکستان سے غالباً چار پانچ گھنٹے پیچھے تھا۔اس لئے 8 گھنٹے کی پرواز صرف تین گھنٹوں کے فرق سے دن میں ہی اتری تھی۔اس لئے دوپہر کا کھانا کھا کر میں سو گیا۔بہت تھکن تھی اس لئے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔رات کو آنکھ کھلی کسی نے نہیں جگایا۔معلوم ہوا ہمارے میزبان صاحب کام پر چلے گئے ہیں۔اکیلے رات کا کھانا کھایا اب چونکہ نیند بھر چکی تھی۔لہذا باہر ٹہلنے نکلا تو سردی کی وجہ سے سڑکیں سنسان تھی۔ایک آدھ ریسٹورنٹ کھلا تھا اور ایک آدھ بار کھلا تھا۔اکیلے کا خوف بھی غالب تھا۔لہذا گھر واپس آ گیا کیونکہ یہاں زیادہ آبادی بھی نہیں تھی۔نہ کوئی پاکستانی نظر آیا۔کافی رات گئے تک جاگتا رہا پھر سو گیا۔دس بجے صبح ہمارے میزبان تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ وہ ایک فیکٹری میں کام کرتے ہیں جہاں 12 گھنٹے کام ہوتا ہے جس میں چار گھنٹے اوور ٹائم ہے۔رات کی ڈیوٹی کرتے تھے۔جس سے تقریباً دو تنخواہوں کے برابر معاوضہ مل جاتا ہے۔جس سے وہ جس مکان میں رہتے تھے اُس کا قرضہ اتر رہا تھا اور یہ مکان انہوں نے 5 ہزار پونڈ میں خریدا تھا۔جس کی قسطیں اتارنے کے لئے وہ رات کی

دوسری تصنیف گردشِ ایام کی رونمائی کے موقع پر

ڈیوٹی اور اوورٹائم کرتے ہیں۔صرف ہفتہ اوراتوار کی چھٹی کرتے ہیں۔لہذا انہوں نے دن میں بھی معذرت کرلی۔کیونکہ تمام دن وہ سوتے تھے۔میں نے اُن سے کہا کہ ہفتہ کے دن وہ مجھے لندن گھمادیں تاکہ میں لندن سے واقف بھی ہوجاؤں۔چنانچہ انہوں نے ہفتہ اوراتوار خوب لندن کی سیر کراوائی۔یہاں میں نے پہلی انڈین فلم مغل اعظم دیکھی۔وہ آدھے پونڈ کا ٹکٹ تھا جس میں انٹرویل میں دوعدد سموسے بھی ملے۔یہ علاقہ ایسٹ لندن کا تھا یہاں بھارتی اور پاکستانی کافی تعداد میں رہتے تھے۔بالکل لی مارکیٹ کی طرح (بیک ورڈ) قدیم علاقہ تھا دوشو دیکھے،رات ایک ملباری کے ہوٹل سے پاکستانی کھانا کھایا بالکل پاکستان کے طرز پر جب کاؤنٹر پر پہنچا تو اُس نے آواز لگائی دو بھائی سے ایک پونڈ لو۔میرے میزبان نے پھر پیسے دینے چاہے تو میں نے ناراضگی سے کہا کہ اب آپ خرچ نہیں کریں گے میں خرچ کرونگا ورنہ میں آپ کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔بڑی مشکل سے وہ مجھے پیسے دینے پر راضی ہوئے۔ایک آدھ کاروباری کام بھی تھا وہ پیر کو ملنے کے لئے سنٹرل لندن کے وکٹوریہ ہوٹل جس کا نام گروونر ہوٹل تھا۔اُس میں ٹھہر گیا بہت بڑا ہوٹل تھا بڑے بڑے کمرے تھے۔مگر کرایہ صرف تین پونڈ تین شلنگ تھا۔ناشتے کا بل اضافی ادا کرنا پڑا تھا۔ایک ہفتے تک لندن میں ٹھہرا رہا کئی پاکستانی دوست بن گئے۔ان دنوں بہت کم لوگ پاکستان سے باہر جاسکتے تھے۔کیونکہ پاسپورٹ کا حصول اتنا ہی مشکل تھا جتنا آج کل ویزوں کا حصول یعنی پہلے ویزے تھے تو پاسپورٹ نہیں ہوتے تھے۔اب پاسپورٹ ہیں تو ویزے نہیں ملتے۔انتہائی ستا زمانہ تھا۔حکومت پاکستان صرف دوسو ڈالر فارن ایکسچینج دیتی تھی۔جو دوسال کے بعد ہی ملتا تھا۔بقایا کام آپ کو ہُنڈی کے ذریعے کرانا پڑتا تھا۔ڈالر حکومت کے ذریعہ 4 روپے بارہ آنے (475 پیسے) میں ملتا تھا۔جبکہ ہنڈی میں 9 روپے میں ملتا تھا۔یعنی ہر کرنسی تقریباً دُگنے داموں بلیک سے ملتی تھی۔لہذا بچا بچا کر خرچ کرنا پڑتا تھا۔بلکہ اگر آپ اس کو کنجوسی سے خرچ کرنا کہیں تو غلط نہیں ہوگا۔اُس کے بعد بہت مرتبہ لندن آتا رہا۔پھر مانچسٹر،لیک

تیسری کتاب کی رونمائی حالات وواقعات

ڈسٹرکٹ، برسٹل جاتا رہا۔ بہت خوبصورت علاقہ تھا ایک مرتبہ ہمارے مشہور کرکٹر ظہیر عباس کا بھی مہمان رہا۔ وہ برسٹل سے مجھے لندن لینے آئے۔ اُن کی میزبانی بہت پُرخلوص تھی۔ ایک ہفتے اُن کے گھر برسٹل میں مقیم رہا۔ دن بھر اُن کا میچ دیکھتا تھا۔ رات اُن کے ساتھ گھومتا تھا۔ بڑے یادگار دن تھے آج تیس سال گزر چکے ہیں مگر گزرا ہوا کل لگ رہا ہے۔ خاص طور پر جب میں امریکہ سے 1976ء میں لندن پہنچا تو امریکہ سے میں نے اُن کو فون کر دیا تھا۔ ائرپورٹ پر وہ اپنی بیگم نجمہ کے ساتھ تشریف لائے واپسی پر نجمہ نے مجھ سے کہا کہ بھائی آپ گاڑی چلالیں کیونکہ رات کا وقت ہے اور دو ڈھائی گھنٹے کا راستہ ہے یہ میچ کھیل کر آئے ہیں کافی تھکے ہوئے ہیں اور کبھی کبھی یہ گاڑی چلاتے ہوئے نیند بھی لے لیتے ہیں۔ میں گھبرا گیا کیونکہ نیویارک سے آٹھ گھنٹے کی فلائٹ سے لندن پہنچا تھا۔ لہذا میں خود بھی تھکا ہوا تھا۔ مگر جب میں نے یہ سُنا کہ موصوف گاڑی چلاتے میں نیند بھی لے لیتے ہیں۔ تو بادلِ ناخواستہ حامی بھر لی راستہ میں ایک پیٹرول پمپ پر گاڑی روک کر گیس لینے کے لئے رُکے۔ ظہیر عباس نے شیشہ اتار کر پیٹرول بھرنے کا آڈر دیا۔ تو وہ پیٹرول ڈالنے والا بار بار ظہیر عباس کو غور سے دیکھ رہا تھا جب پیٹرول سے فارغ ہوا۔ تو اُس نے پوچھا کیا آپ ہی "زیڈ" ہو ظہیر عباس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بہت خوش ہوا اس نے ظہیر سے ہاتھ ملایا۔ اپنی طرف سے کولڈ ڈرنک بھی ہم سب کو پیش کی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ انگریزوں نے ظہیر عباس کا نام زیڈ رکھا ہوا ہے اور وہ ہمارے کھلاڑیوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ راستہ چونکہ ھائی وے تھا ٹریفک رات کی وجہ سے زیادہ نہیں تھی لہذا دو گھنٹوں میں ہم پہنچ گئے۔ ظہیر اور نجمہ دونوں نے میری ڈرائیونگ کی تعریف کی۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ پہلی مرتبہ میں پاکستان کے باہر گاڑی ڈرائیو کی ہے۔ اور میرے پاس لائسنس بھی نہیں تھا۔ کیونکہ پاکستانی ڈرائیونگ لائسنس غیر ممالک میں کارآمد نہیں ہوتا اس لئے میں ساتھ نہیں رکھتا تھا۔ یہ سُن کر دونوں اُچھل پڑے اگر پولیس خدانخواستہ کہیں روک لیتی تو سزا بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے کہا موت کے

1987ء میں جرمنی میں ٹوتھ پیسٹ کی ٹریننگ کے موقع پر

خرم خلیل کے ساتھ جرمنی میں خوبصورت باغیچے میں

منھ میں جانے سے بہتر تھا کہ جیل جاتے، کیونکہ ہائی وے پر اگر آپ نیند فرما جاتے اور گاڑی ٹکرا دیتے تو موت یقینی تھی۔ لہذا میں نے یہ رسک لینا زیادہ بہتر سمجھا تھا جس سے تین افراد کو فائدہ تھا۔ خیر مذاق میں وہ مجھے کئی دن تک چھیڑتے بھی رہے۔ لندن ہمیشہ سے بڑا غریب نواز شہر ہے یہاں دنیا کی تمام قومیں آباد ہیں۔ یہاں پہلے بالکل تعصب نہیں ہوتا تھا۔ ہر انگریز دوسری قوموں کا احترام کرتا تھا۔ نوکریاں، پاسپورٹ، شادیاں ایک عام بات تھی۔ اُس زمانے میں چند ہزار پاکستانی رہتے تھے۔ آج لاکھوں پاکستانی معہ اپنے خاندانوں کے ساتھ آباد ہیں۔ اب یہاں کے شہری بن چکے ہیں جن میں تاجر، ڈاکٹر، لیبر، انجینئر، ٹیچرز غرض ہر شعبہ میں وہ نظر آتے ہیں۔ پاکستانی کھانے برطانیہ میں بہت مشہور ہیں۔ خاص طور پر باربی کیو تو انگریزوں کا من بھاتا کھانا ہے۔ ویک اینڈ پر تو پاکستانی ریسٹورنٹ اُن سے بھرے ہوتے ہیں۔ انگریز عوام دوست ہوتے تھے۔ کالے گورے کا فرق نہیں ہوتا تھا۔ برابری کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے یہ لوگ بہت ملنسار تھے۔ برطانیہ کے لوگ آج بھی ایشیائی باشندوں سے مل جل کر رہتے ہیں۔ نسلی رنگ وقوم کا بہت کم فرق ہے۔ حالانکہ اُن کی خوراک تہذیب و تمدن میں بہت فرق ہے مسلمانوں کو آزادی ہے کہ وہ اپنے کلچر کو فروغ دے سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی مساجد آج برطانیہ کے کونے کونے میں واقع ہیں اور اسی طرح ایشیائی ریسٹورنٹس بھی ہر چھوٹے بڑے شہروں میں عام ہیں۔ ان میں زیادہ تر برطانوی نوجوان اور عمر رسیدہ افراد بڑے شوق سے جاتے ہیں۔ خاص طور پر باربی کیو جس کو وہ تندوری کے نام سے جانتے ہیں اُن کی مرغوب غذا بن چکی ہے۔ ہمارے بیشتر ریسٹورنٹس میں ویک اینڈ پر جگہ ہی نہیں ملتی۔ اور تو اور انہوں نے اپنے چرچ بھی مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کر دیئے ہیں اور آج اُن کی جگہ پر مساجد بن چکی ہیں۔

پہلا عالمی دورہ (Round the World Trip)

ٹیلی نار کے ساتھ معاہدہ کے موقع پر

1970ء میں پہلا عالمی دورہ افغانستان سے شروع کیا۔ وہاں سے ایران، ترکی سے ہوتے ہوئے ہم ایتھینز پہنچے افغانستان میں بھارت کی فلمیں دیکھیں۔ کابل میں پختونستان کا جھنڈا دیکھا۔ چونکہ ہم پاکستان، ایران، افغانستان کے امریکی ادویات کریمیرار بن کارپوریشن KUC کے ایجنٹ تھے۔ لہذا کاروباری دورہ تھا۔ اُس زمانے میں Red Pass پر بھی پاکستانی عوام آجاسکتے تھے۔ خاص طور پر پشاور کے پٹھان تو انہی ریڈ پاس پر سفر کرتے تھے۔ افغانستان کے عوام پاکستان سے محبت کرتے تھے۔ مگر حکومت شاہ ظاہر شاہ کے بھارت سے اچھے تعلقات تھے۔ اسی طرح ایران کے عوام پاکستانی عوام سے محبت نہیں کرتے تھے۔ اُن کو غالباً کسی خاص مصلحت کے تحت پاکستان دشمنی کا سبق پڑھایا گیا تھا۔ مگر شاہ ایران کے پاکستان سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایران میں ایک دن جمعہ کی نماز کے لئے پاکستان ایمبیسی جانا تھا۔ کیونکہ صرف پاکستان ایمبیسی میں مسجد تھی۔ بقایا جگہ شیعہ حضرات کے لئے امام بارگاہ ہوتی تھی۔ ٹیکسی کے ذریعہ پاکستان ایمبیسی پہنچا تو ڈرائیور نے اُسی سڑک پر ½2 کلومیٹر دور اتار دیا کہ سڑک کا نام یہی ہے۔ مجھے اب خود ایمبیسی تلاش کرنی تھی۔ ایک شخص نزدیک سے گزرا تو میں نے اُس سے کہا کہ پاکستانی سفارت خانہ کہاں ہے۔ اُس نے اشارہ کیا کہ میرے پیچھے آؤ۔ میں اُس کے پیچھے چل پڑا کوئی پانچ منٹ بعد مجھے ایک عمارت پر پاکستانی جھنڈا نظر آیا۔ میں نے اُس شخص کا شکریہ ادا کیا اور ایمبیسی کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اُس ایرانی شخص نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں تم نے جانا تھا میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے کہا کہ دس ایرانی ریال دو، میں نے تمہیں یہ جگہ دکھائی ہے میں نے جیب سے ایرانی کرنسی میں اسے راستہ دکھانے کی قیمت ادا کی جو نہ اُس سے پہلے نہ اُس کے بعد مجھے ایسے واقعہ کا سابقہ پڑا تھا۔

افغانستان کے لوگ پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے تھے جس سے بھی ملاقات ہوتی تھی وہ کھانے کی دعوت ضرور دیتے تھے مگر ایرانی ایسے خلوص کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ میں نے اپنا ہنی مون بھی

گردشِ ایام کی رونمائی میں معین الدین حیدر کے ساتھ

افغانستان کے شہر مزار شریف میں شادی کے چار سال بعد منایا تھا۔

ترکی کا سفر:

اُس زمانے میں ترکی اور چائنا کے عوام کو پاکستان کے عوام سے بڑھ کر محبت کرتے دیکھا، ترکی کے عوام تو پاکستانیوں کی خاطر و مدارت میں خود پاکستان کے اپنے دوست احباب سے بڑھ کر محبت کرتے تھے۔ اُس زمانے میں ایک ڈالر کے عوض 14 ترکش لیرا ملتے تھے۔ زیادہ مہنگائی نہیں ہوتی تھی اب تو ایک ڈالر کئی لاکھ لیرے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مگر ترکی کے عوام کا پاکستانی عوام سے محبت آج بھی سب سے بہتر ہے۔

بیروت کا سفر:

1972ء میں یورپ کے دورے سے واپسی پر بیروت ایئرپورٹ جانا تھا۔ کیونکہ وہاں سے جدہ ایئرپورٹ جا کر عمرہ ادا کرنا تھا۔ صرف ایک رات کا STAY تھا جو برٹش اور سیز ائر لائنز کارپوریشن نے مجھے ایک دن ٹھہرنے کیلئے ایئرپورٹ سے ٹیکسی اور ہوٹل میں ٹھہرنے کا واؤچر دیا۔ باہر سامان کے ساتھ آیا تو ٹیکسی والے نے واؤچر لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ دس ڈالر کرایہ ادا کرنا ہوگا۔ وہاں پولیس والا کھڑا تھا میں نے اُس سے شکایت کی تو اُس نے کہا واپس جا کر BOAC کے عملہ سے رابطہ کریں انہیں اُس کی شکایت کریں میں نے اپنا سامان پولیس والے کے پاس چھوڑا اور واپس ایئرپورٹ کی عمارت میں BOAC والوں کے پاس پہنچا تو سب سے پہلے خاتون نے مجھ سے پوچھا تمہارا سامان کہاں ہے میں نے کہا وہ میں باہر ایک پولیس والے کے حوالے کر آیا ہوں۔ اُس نے کہا جلدی کرو اور واپس اُس پولیس والے سے اپنا سامان واپس لاؤ ساتھ ہی وہ میرے ہمراہ کاونٹر سے نکل کر ایئرپورٹ کے باہر

گردشِ ایام میں مرحوم ایس ایچ ہاشمی کو شیلڈ پیش کر رہے ہیں

بھاگی ،ہم دونوں بھاگتے ہوئے واپس ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آئے دیکھا تو وہاں کوئی پولیس والا نہیں تھا اور نہ ہمارا سامان تھا۔اُس نے اپنے واکی ٹاکی سے کسی سے بات کی تو دس منٹ بعد ایک پولیس والا ہمارا سامان واپس لے کر آ گیا۔اُس نے کہا خدا کا شکر کرو کہ تمہارا سامان مل گیا۔دراصل یہاں پولیس والے بھی مسافروں سے ایسی حرکت کر لیتے ہیں۔آئندہ کسی پر بھی اعتبار نہ کرنا وہ تو تمہاری خوش قسمتی ہے ہمارے عملے نے اس پولیس والے کو سامان لیجاتے دیکھ لیا تھا۔تو انہوں نے اُس سے واپس دلوادیا چونکہ صرف ایک رات بیروت میں ٹھہرنا تھا لہذا ہوٹل پہنچ کر میں نے اپنے دوست کو فون کیا تو کسی نے اٹینڈ نہیں کیا سوچا جا کر خود مل کر آجاتا ہوں۔رات کے سات بجے تھے ہوٹل سے باہر آ کر میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے جو پتہ میرے پاس لکھا تھا اُس کو دکھایا اُس نے کہا کہ صرف جانا ہے یا واپس بھی آنا ہے میں نے کہا جانا اور واپس بھی آنا ہے اُس نے دس ڈالر مانگے میں نے اُس سے مول تول کئے تو وہ 8 ڈالر پر راضی ہو گیا۔بیروت سے میں بالکل ناواقف تھا ٹیکسی میں بیٹھ گیا دس پندرہ منٹ بعد میں اُس جگہ پہنچا تو وہ دوست نہیں تھا۔میں نے اُس کے نام خط لکھ کر دیا کہ میں فلاں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں اور دوسرے دن شام میری جدہ فلائٹ ہے اگر مجھ سے ملنا ہے تو مجھے ہوٹل پر فون کر لو۔دوسرے دن اُس کا صبح ہی صبح فون آیا کہ میں رات بہت دیر سے گھر آیا تھا سوچا کہ تمہیں رات تکلیف نہ دوں لہذا اب صبح تم مجھ سے ملنے آجاؤ۔میں نے سوچا پھر دس ڈالر خرچ ہونگے تو میں نے کہا تم کیوں مجھ سے ملنے نہیں آجاتے تو وہ بہت ہنسا کہ میرا دفتر تو تمہارے ہوٹل کی صرف دوسری بلڈنگ سے ملحق ہے اور تم رات بھی آچکے ہو تو میں نے سوچا کہ تم ½ ۲ منٹ میں ہی آجاؤ گے۔میں نے اُس کو رات کا ٹیکسی ڈرائیور کا واقعہ سُنایا کہ اُس نے دس پندرہ منٹ میں تمہارے گھر پر چھوڑا تھا اور واپسی پر بھی اتنا ہی ٹائم لگایا تھا وہ بہت ہنسا اور کہنے لگا بھائی یہ لبنان ہے یہاں ہر فراڈ ہو سکتا ہے تم ہمیشہ جب بھی لبنان آؤ تو کسی پر بھروسہ نہ کرو، بیروت میں صرف ایک سڑک ہے جو ایئرپورٹ سے شروع ہوتی اور

گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد کو گولڈ میڈل پہنا رہے ہیں

شیخ رشید گردشِ ایام کی رونمائی کے موقع پر

بیروت کے آخری سرے تک جا کر ختم ہوتی ہے۔اس کا نام الحمرہ اسٹریٹ ہے آپ کسی بھی ٹیکسی میں بیٹھیں یہ صرف ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی 25 سینٹ (لبنانی پاؤنڈ) لیتے ہیں جو ایک ڈالر میں تین آتے ہیں۔اُس کا بھی ایک چوتھائی سکہ بنتا ہے۔اُس ڈرائیور نے آپ کے ساتھ فراڈ کیا کہ آدھے گھنٹے تک وہ آپ کو سڑکوں پر گھماتا رہا وہ سمجھ گیا ہوگا کہ آپ اجنبی ہیں ورنہ یہ بلڈنگ تو اسی ہوٹل سے ملحق ہے۔یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ بیروت کے لوگ اتنے چالاک تھے اور ثابت بھی ہوا کہ اسی ایک سڑک پر پورا شہر آباد تھا۔ہزاروں شراب خانے،جوا خانے اور کھانے کے ریسٹورنٹ تھے جہاں لوگوں کا اژدھام ہوتا تھا۔رات کے دو بجے تک سڑکیں،گلیاں عوام سے بھری ہوتی تھیں اسی وجہ سے عوام عیاش،چالاک اور فراڈ میں بہت آگے ہوتے تھے۔اسی وجہ سے 15 سال بعد بیروت اپنے ان ہی بُرے کاموں کی وجہ سے تباہ ہوا۔اُس کے بعد میں نے کبھی بیروت جانے کی ہمت نہیں کی۔

سعودی عرب کا سفر:

بیروت سے سعودی عرب پہنچا پہلا عمرہ کرنا تھا۔اس وقت جدہ بہت ہی چھوٹا شہر ہوا کرتا تھا یہ 1972ء کا سال تھا۔اتفاق سے ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی جو پاکستان سے جدہ میں اسی BOAC میں کام کرتے تھے۔انہوں نے اپنے گھر ٹھہرایا اور رات جدہ سے مکہ عمرہ کے لئے میری مدد کی اور عمرہ کرایا بہت نفیس آدمی تھے،مجھے ان کا پورا نام یاد نہیں البتہ ان کا نک نام قدوائی تھا۔عمرہ ادا کرنے کے بعد واپس انہوں نے مجھے جدہ سے کراچی روانہ کر دیا۔عمرہ کی سعادت کے بعد اگلے سال حج کی ادائیگی کے ارادے سے انٹرنیشنل پاسپورٹ پر 1973ء میں پھر سعودی عرب آ گیا۔عمرہ کیا پھر حج کے زمانے میں حج ادا کیا۔اُس زمانے میں ٹرانسپورٹ بہت خراب ہوتی تھی۔جدہ ایئرپورٹ نان ایئر کنڈیشنڈ ہوتا تھا اور مسافروں کو بھی واپسی یا سفر کے لئے ایک دن پہلے ائیرپورٹ پر بلایا جاتا ۔بسیں بھی پرانی اور نان

سعودی عرب اسٹمپ لگی ہوئی ہے جس میں لکھا تھا جب آپ آسکا گے.....خالی جگہ ہے

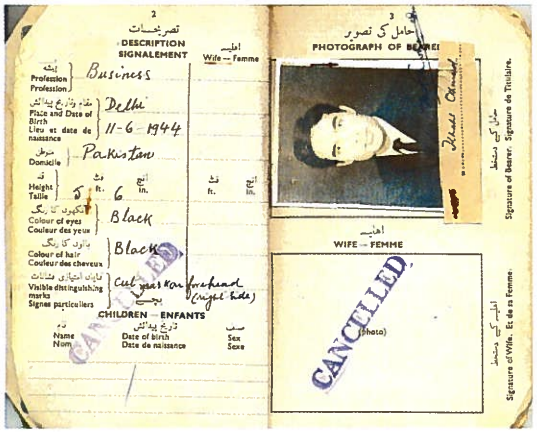

ایئر کنڈیشن ہوتی تھیں گرمی کا زمانہ تھا۔حج بہت ہی تکلیف دہ تھا نہ ہوٹل ہوتے تھے نہ سہولتیں تھیں۔ معمولی سرائیں یا ہوٹل بغیر ائر کنڈیشن ہوتے تھے۔جدہ کا کُل رقبہ شاہراہ عبدالعزیز ہوتا تھا جو تین کلومیٹر کے اندر تھا۔مکانات کچے ہوتے تھے اسی طرح مکہ دو ڈھائی کلومیٹر پر مشتمل تھا۔حجاج مقامی لوگوں کے گھروں کو حج کے لئے کرایہ پر لے لیتے تھے جس کا کل حج کا ایک ماہ کا کرایہ 300 ریال ہوتا تھا۔ ایک ریال اُس زمانے میں تین روپے میں ملتا تھا۔5,4,3,2 اسٹار ہوٹلوں کا کوئی تصور نہیں تھا کچے پکے مکانات ہوتے تھے۔حجاج انہی گھروں میں قیام کرتے تھے۔مکہ میں جنت المالہ یعنی قبرستان شہر سے باہر ہوتا تھا۔میرے ایک عزیز جو حج پر آئے تھے۔حج سے پہلے اُن کا انتقال ہو گیا تھا انہیں دفنانے رات جب جنت المالا پہنچا تو سنسان جگہ پر واقع تھا۔سڑکیں بھی کچی تھیں لائٹیں بھی مدہم تھیں نماز جنازہ حرم میں پڑھایا گیا اور پھر حکومت ہی ان کی تجہیز و تدفین کرتی تھی قبرستان میں ایک بہت بڑا گھڑا تھا۔اُس کے سرے سے پتھر ہٹا کر لاش اُس کے اندر پھینک دی گئی یہ تھی تدفین جو میں نے دیکھی حج سے واپسی پر ایک دن قبل ائر پورٹ پہنچا کاؤنٹر پر میرا پاسپورٹ جو 24 گھنٹے پہلے لیا گیا تھا۔PIA والوں نے بتایا کہ اُن کو معلم نے واپس نہیں دیا اُس کی معلومات کے لئے ایک سامنے الگ کاؤنٹر تھا۔وہاں میں پہنچا تو اُس شخص نے کہا کہ ہاں تمہارا پاسپورٹ میرے پاس ہے۔کیونکہ تم نے اپنے آنے اور جانے کا اندراج پولیس میں نہیں کرایا تھا لہذا 100 ریال جرمانہ ادا کرو۔اتفاق سے میں نے تمام رقم خرچ کر ڈالی تھی۔میرے پاس چند ریال بچے تھے کیونکہ اب صرف واپسی تھی۔خاندان والوں کے لئے تحائف وغیرہ خرید لئے تھے۔میں نے اُس سے کہا کہ میرے پاس اب دینے کے لئے 100 ریال نہیں۔لہذا میرا پاسپورٹ واپس کر دو۔اُس نے انکار کر دیا مجھے غصہ آ گیا میں نے کہا تم کیسے مسلمان ہو کہ ایک دوسرے مسلمان سے جذیہ لیتے ہو شرم نہیں آتی جبکہ میں بتا چکا ہوں میرے پاس نقد رقم نہیں ہے۔تمام ریال اور ڈالر خرچ کر چکا ہوں وہ بھی غصے میں آ گیا کہنے لگا تم نے حج کیا ہے مجھ

کے این اکیڈمی کے دورے کے موقع پر چیئرمین سینٹ محمد میاں سومرو کے ساتھ

پر کوئی احسان نہیں کیا۔100 ریال دو گے تو میں تمہارا پاسپورٹ واپس کروں گا۔چونکہ PIA کی فلائٹ لیٹ ہو رہی تھی۔پی آئی اے کا ایک نمائندہ میری طرف آیا مجھ سے پوچھا کہ تمہارا نام یہی ہے تو میں نے کہا ہاں کہنے لگا چلو جہاز پر تمہارا سامان جا چکا ہے۔تم یہاں کیا کر رہے ہو میں نے تمام واقعہ سُنایا اُس نے بھی اُس شخص سے درخواست کی کہ ان کو جانے دو اُس نے کہا 100 ریال کے بغیر جانے نہیں دونگا۔اُس شریف پاکستانی نے اُس کو اپنی جیب سے 100 ریال دیئے اور میرا پاسپورٹ لے کر مجھے جہاز پر چڑھایا دیا۔میں نے اُس سے پتہ مانگا کہ کراچی میں اُس کے گھر والوں کو 100 ریال کے برابر رقم ادا کر دونگا۔اُس نے کہا آپ بھی پاکستانی ہیں میں بھی پاکستانی ہوں کوئی بات نہیں مجھے کچھ نہیں چاہئے۔اس طرح میں جہاز میں سوار ہوا اور آئندہ کے لئے سعودی عرب آنے کی توبہ کر لی کہ جو کام غیر مسلم نہیں کرتے ہمارے مسلمان کس طریقے سے جرمانے لے کر کرتے ہیں۔اس طرح تقریباً بیس سال تک سعودی عرب نہیں گیا۔میرے چھوٹے بھائی عبداللہ نینی تال والا کو جگر کی بیماری لاحق ہوگئی تمام ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔اُن کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ایک حج کر لیا جائے۔حالانکہ وہ پہلے حج کر چکے تھے میں نے اُن سے وعدہ کیا انشاءاللہ وہ حج ضرور کریں گے۔اللہ نے ان کی زندگی زیادہ نہیں لکھی تھی حج کے موقع سے پہلے وہ انتقال کر گئے۔اُن کا وعدہ نبھانے کے لئے میں نے 1992ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کیا۔پھر الحمدللہ ہر سال حج کی سعادت ملتی رہی۔اسی طرح رمضان المبارک میں متواتر عمرہ کی سعادت ملتی رہی اور اپنے تمام اہل وعیال کے ساتھ ہر سال 1992ء کے بعد سے عمرہ کی سعادت ہر رمضان میں ملتی ہے۔اور ہر سال ایک عمرہ اپنے مرحوم بھائی کی طرف سے میں ادا کرتا ہوں۔شاید چھوٹے بھائی کی وجہ سے میں نے سعودی عرب نہ جانے کا ارادہ ختم کر دیا تھا۔ورنہ جس طرح سے اُس پہلے حج میں میرے ساتھ واقعات ہوئے تھے کوئی بھی شخص دوبارہ اُس سرزمین پر جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ان کا اخلاق بالخصوص بنگلہ دیشی، پاکستانی، بھارتی

جمعیت ٹرسٹ میں ایس ایچ ہاشمی کے ساتھ

اورغریب ممالک کے حاجیوں کے ساتھ بہت خراب ہوتا تھا۔اکثر دوکاندارتو اُن کی شکل دیکھتے ہی مُنہ پھیر لیتے تھے۔مگراب نئی نسل جو اب جوان ہوچکی ہے پڑھی لکھی سمجھدار بھی ہے۔اُس کومعلوم ہے کہ اب معیشت ہی سب کچھ ہے اس لئے اُن کی طرز زندگی تبدیل ہوچکی ہے پھرسعودی حکومت نے بھی زراعت صنعت وحرفت میں کافی ترقی کرلی ہے رہن سہن تبدیل ہوچکا ہے ہرسال رمضان شعبان میں تقریبًا 25لاکھ عازمین عمرہ پوری دنیا سے آتے ہیں۔اسی طرح چندلاکھ حجاج کے بجائے تیس لاکھ تک مسلمان تقریبًا دنیا کے ہرملک سے حج کیلئے آتے ہیں۔خانہ کعبہ اورمسجد نبوی میں بہت توسیع ہوچکی ہے عبادت گزاروں کا مجمع ہوتا ہے نئے نئے ہوٹل بن چکے ہیں چندکلومیٹرمکہ کا رقبہ پھیل کرشہر سے باہرجاچکا ہے ہوٹل کے کرائے نزدیک حرم بہت مہنگے ہوچکے ہیں۔خصوصًا حج اوررمضان میں تو دس دس گُنا زیادہ ہوجاتے ہیں یوں عام آدمی کی دسترس سے باہرہوتے ہیں۔اس لئے ایرانی،ترکی،سوڈانی، بنگلہ دیشی حجاج یازائرین (حرم) سے دور ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں۔اگرچہ بھارتی اور پاکستانی حجاج وزائرین حدودحرم میں ٹھہرنا ضروری سمجھتے ہیں۔اس طرح وہ پانچ وقتہ نمازیں باآسانی ادا کرلیتے ہیں۔البتہ کھانے پینے کی چیزیں اُسی قیمتوں میں ٹھہری ہوئی ہیں۔مگرآج کا درہم 16روپے کا ہے جبکہ 1973ء میں صرف تین روپے کا ہوتا تھا۔صرف تیس سال کے مختصرعرصہ میں سعودی عرب نے ہر میدان میں خواہ زراعت ہومعاشیات انجینئرنگ، بینکنگ،کنسٹرکشن،ہوائی جہاز،ٹیلیفون،آئی ٹی سب شعبوں میں ہم سے آگے ہیں۔باوجود اس حقیقت کے ہمارے پاکستانیوں نے انہیں بینکنگ،ہوائی جہاز،بجلی،کنسٹرکشن،معاشیات سب ہی عہدوں پررہ کراُن کی مدد کی تھی۔ابتدائی دور میں تو اُن کے اسٹیٹ بنک آف سعودی عرب کے گورنر بھی پاکستانی تھے۔80فیصد ڈاکٹر ،پروفیسرصاحبان کاتعلق بھی پاکستان سے تھا۔70فیصدمزدوربھی پاکستانی تھے۔پھرسعودی عرب کوحج اورعمرہ کے زائرین کی وجہ سے بھی زبردست ترقی ہوئی۔جبکہ ابتدائی دورمیں بہ مشکل چندلاکھ عازمین

کے این اکیڈمی میں شہزادہ کلیم الدین اوراعجاز العارفین کے ساتھ۔

میجرجنرل احتشام ضمیرکوشیلڈ پیش کرتے ہوئے

حج آتے تھے۔عمرہ زائرین کی تعداد تو ایک لاکھ سالانہ بھی نہیں تھی جو مستقل بڑھ رہی ہے اُسی لحاظ سے یہاں کے حکمرانوں نے جن میں شاہ فہد بن عبدالعزیز مرحوم اور شاہ فیصل شہید نے توسیع خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے۔آج بیک وقت خانہ کعبہ میں 25 لاکھ افراد حدود حرم میں نماز ادا کر سکتے ہیں اور تقریباً 5 لاکھ افراد فریضہ حج کے دوران طواف ادا کر سکتے ہیں۔پہلے تو کچی اور پتھریلی زمین پر طواف کیا جاتا تھا۔مگر اب باقاعدہ سنگ مرمر پر تین منزلہ عمارتوں میں جو جدید سہولتوں سے آراستہ ہو چکے ہیں عازمین با آسانی اپنے فرائض ادا کر سکتے ہیں۔خانہ کعبہ میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ تک حدیث مبارک میں ذکر آیا ہے اور مسجد نبوی میں ایک ہزار سے پچاس ہزار تک کے متعلق ذکر پایا جاتا ہے۔حج اور عمرہ کے لئے مشہور ہے کہ جب تک وہاں سے بلاوا نہیں آتا مسلمان اس فریضہ سے مستفیض نہیں ہو سکتے۔حج اہلِ ثروت کیلئے صرف ایک لازمی ہے اس کے بعد تمام نفل حج شمار ہونگے۔عمرہ فرض نہیں ہے البتہ سنتِ موکدہ ہے۔نمازوں کا ثواب اگر جمع کر لیا جائے تو ایک مسلمان کو جس کی عمر 60 اور 70 سال پہنچنے تک ہزاروں سال پر مشتمل ثواب کما سکتا ہے۔البتہ ایک خیال ضرور رکھنا ہوگا۔کہ سعودی عرب کے لوگ بہت غصہ ور Short Tamper ہوتے ہیں۔اُن کا رویہ غیر سعودیوں خصوصاً پاکستان، بھارت، بنگلہ دیشیوں سے اچھا نہیں ہوتا۔اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے سعودی عرب کی تعمیر میں انہی تین قوموں نے حصہ لیا تھا تو وہ ہر ایک کو مزدوروں کی نگاہ سے دیکھتے ہونگے۔حالانکہ خود سعودی عرب میں پاکستان کی طرح غربت بھی پائی جاتی ہے۔امیر طبقہ بہت امیر ہے اور غریب طبقہ بہت غریب ہے اب البتہ درمیانی طبقہ بھی ظہور پذیر ہو چکا ہے اس میں نوجوان پڑھے لکھے شامل ہیں۔سعودی عرب کی ایک عجیب وغریب پالیسی بھی ہے کہ آپ ایک شہر سے دوسرے شہر صرف اجازت نامہ سے آجا سکتے ہیں۔عمرہ اور حج جدہ، مکہ اور مدینہ تک محدود ہے بقایا شہروں کے لئے اجازت نامے ضروری ہیں۔حتی کہ ایک شہر سے دوسرے شہر داخل ہوتے وقت پاسپورٹ یا اقامہ

جمعیت ٹرسٹ میں ہاشمی صاحب کو شیلڈ دیتے ہوئے

مدرسہ تعلیم القرآن کے ٹرسٹی کی حیثیت سے شمولیت

پولیس چوکی پر چیک کیا جاتا ہے جو کسی اور ملک میں نہیں ہوتا، تیل معدنیات سے بھی سعودی عرب خود کفیل ہے۔

یورپی ممالک کا سفر:

یورپی ممالک جن میں ہالینڈ، بیلجیم، سوئیڈن، اٹلی، ڈنمارک شامل ہیں بہت مختصر قیام رہا۔ مجموعی طور پر صرف سیاحت تک محدود رہا۔ ان ممالک سے میرے ذاتی کاروباری مراسم نہیں تھے۔ کئی مرتبہ کوشش بھی کی مگر ان ممالک کی درآمدی اشیاء بہت مہنگی ہوتی تھیں۔ ہمارا چونکہ ادویات یا اس سے متعلق کیمیکل یا پیکنگ میٹریل ہوتا تھا وہ چائنا، یا کمیونسٹ ممالک کی نسبت بہت مہنگا ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے تجارتی دورے دو یا تین ہی ہو سکے۔ سوائے اس خوبی کے بہت خوبصورت نظارے جن میں دریا، پہاڑ، پھل، پھولوں سے لدے درخت بہترین اور جدید ترین سفری نظام خواہ سڑکوں کے ذریعے ہو یا سمندری یا ہوائی راستوں سے ہو ایک سے ایک عمدہ تجربہ ہوتا تھا۔ لوگ بھی بہت ملنسار خوبصورت پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر اسکول، کالج، ہوٹل عمارتیں، شاہی قلعہ، چڑیا گھر، کیسینو، عجائب گھر سب قابل دید ہوتے ہیں۔ بندہ اکیلا بھی بور نہیں ہوتا اوپر سے موسم اتنا خوشگوار کہ جنت کا گمان ہوتا ہے۔ سڑکیں انتہائی صاف ستھری۔ ٹریفک اتنی ڈسپلن میں ہوتی ہے کہ اگر رات کے بارہ بھی بجے ہوں تو کوئی سگنل توڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ پولیس بھی بہت با اخلاق ہے اگر آپ راستہ بھول جائیں یا راستہ پوچھیں تو ایک عام آدمی بھی آپ کی مدد کے لئے تیار ملے گا۔ ریلوے اسٹیشن اتنے صاف ستھرے ہونگے کہ آپ کو ٹرین کے انتظار میں بوریت نہیں ہوگی۔ تمام ضروری کھانے پینے کی اشیاء کے اسٹال ہونگے۔ بیت الخلاء صاف ستھرے ہونگے ہر بڑے ریلوے اسٹیشن کے باہر تین سے چار اسٹار ہوٹل ہونگے خود ریلوے کے اپنے بھی زیر انتظام ہوٹل ہوتے ہیں جو درمیانی درجہ کے کرایہ پر مل جاتے ہیں

کے این اکیڈمی کے دورے کے موقع پر وزیر زراعت حسن علی چانیہو شجرکاری کررہے ہیں

یہ صاف ستھرے ہوادار ہوتے ہیں۔سرد ممالک ہونے کی وجہ سے اکثر ہوٹلوں میں ایئر کنڈیشنز نہیں لگے ہوتے ہیں۔پاکستان کی نسبت بہت مہنگائی ہے۔عام طور پر ایک روٹی 100 روپے تک ایک کھانے کی پلیٹ 600 روپے سے لے کر ایک ہزار روپے تک ہوسکتی ہے۔میں نے 100,100 روپے میں عام سموسے کی پلیٹ جس میں صرف تین عدد ہوتے ہیں کھانے کا اتفاق رہا ہے۔گوشت البتہ حلال بہت مشکل سے ملے گا۔صرف پاکستانی یا مسلمان ممالک کے ریسٹورنٹس جن میں ترکی سرفہرست ہے۔وہاں مختلف کبابوں کی شکل میں ملے گا۔مگر جیب خالی کرالے گا۔بہتر ہے کہ دام دیکھ کر ہی آڈر دیں تو اس میں عافیت رہے گی ورنہ بل آنے پر پسینہ بھی آنے کا امکان ہے۔دراصل 30 سال میں ہماری کرنسی 5 روپے کے ڈالر سے 60 روپے یعنی 12 گُنا گر چکی ہے۔تو ہماری قیمتوں سے کم از کم 12 گُنا تو قیمت ویسے ہی زیادہ ہوگی۔پھر بعض ممالک کی کرنسی 30 گُنا تک بڑھ چکی ہے۔تو اسی لحاظ سے اُس ملک کی قیمت خرید بڑھے گی۔وہاں مہنگائی کی ایک وجہ مزدوروں کی تنخواہیں، جگہ کا کرایہ بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔یہاں ٹیکس کی شرح بھی بہت زیادہ ہے ہر چیز جو آپ خریدتے ہیں اُس پر ٹیکس ہے۔مگر اسی طرح اُس کے بدلے عوام کو بے پناہ سہولتیں بھی میسر ہیں۔سوشل سیکورٹی، مفت تعلیم، علاج معالجہ، بے روزگاری الاؤنس، عوامی پارکس، بہترین سڑکیں ہی ان کا نعم البدل ہیں۔یعنی اگر آپ بھرپور ٹیکس دے رہے ہیں۔تو بھرپور آرائشی لوازمات سے مستفیض ہوسکتے ہیں۔بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بھی بہت ٹیکس تو نافذ ہیں۔مگر اُس کے مقابلے میں عوام کو سہولتیں بہت کم ہیں بس یہی فرق ہے یورپین سسٹم اور پاکستانی سسٹم کا، وہ ٹیکس عوام سے وصول کر کے عوام پر خرچ کرتے ہیں۔جبکہ ہم عوام سے ٹیکس وصول کر کے حکمرانوں، غیر معمولی افواج، پولیس، رینجرز، سرکاری اہلکاروں کی بھرمار پر خرچ کر ڈالتے ہیں۔جبکہ تعلیم جیسی اہم ضرورت کو نظر انداز کر کے بہ مشکل بجٹ کا 2 فیصد بھی خرچ نہیں کرتے۔اسی وجہ سے ہماری شرح تعلیم بہ مشکل 20 فیصد تک پہنچتی ہے وہ بھی شہروں کی حد تک

چیف جسٹس شریعت کورٹ حاذق الخیری کے اعزاز میں عشائیہ میں شیر باز مزاری معین الدین حیدر نمایاں ہیں

محدود ہے۔

سوئیزرلینڈ کا سفر:

سب سے پہلے 1970ء میں سوئیزرلینڈ اکیلے جانے کا اتفاق ہوا۔ جرمنی کے شہر فرینکفرٹ سے زیورخ پہنچا۔ بہت ہی چھوٹا ائرپورٹ تھا یعنی کراچی سے بھی چھوٹا تھا۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت گول بلڈنگ تھی۔ غالباً ایک یا دو منزل ہوگی لیکن کاؤنٹر تھے میں نے پاسپورٹ رکھا اُس نے پوچھا اس میں تو سوئیزر لینڈ کا ویزہ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ تمام یورپ گھوم کر آرہا ہوں کسی نے بھی ویزے کا نہیں پوچھا اُس نے جواباً کہا یہ سوئیزرلینڈ ہے یہاں ویزہ درکار ہے میں نے کہا میں تو گھومنے نکلا ہوں اگر آپ اجازت دیں گے تو میں سوئیزرلینڈ گھوم لوں گا۔ اور آئندہ آتے ہوئے اس کا خیال رکھوں گا۔ اُس آفیسر نے کہا اگر آپ اپنا پاسپورٹ جمع کرادیں تو میں آپ کو اجازت نامہ بنادوں گا۔ واپسی پر آپ کو اسی ائرپورٹ پر آنا پڑے گا تو آپ اپنا پاسپورٹ واپس لے سکتے ہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے دراز سے ایک فارم نکالا۔ اُس کو بھرا میرے دستخط لئے اور وہ کاغذ میرے حوالے کردیا۔ اور میرا پاسپورٹ مجھ سے لے کر دراز میں ڈال دیا۔ ائرپورٹ سے باہر آیا تو بہت ہی دلکش نظارہ تھا۔ ٹیکسی لی اور زیورخ شہر روانہ ہوگیا۔ سوئیزرلینڈ کا سکہ فرانک صرف ایک روپیہ 25 پیسے کا تھا۔ یعنی ہمارے سکے سے صرف 25% زیادہ تھا۔ چند دن دوسرے شہر بازل، جنیوا بذریعہ ریل خوب سیر کی پہاڑی گاؤں بھی دیکھے بہت ہی خوبصورت ملک تھا۔ جس میں دریا، پہاڑ، جنگل، ہریالی یعنی چھوٹی سی جنت کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ یورپ کا سب سے صاف ستھرا اور خوبصورت ترین ملک سوئیزرلینڈ کو کہتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اُس کے دس سال بعد 1980ء میں اپنی فیملی کے ساتھ پہلی مرتبہ آیا اور پھر متعدد بار آنا جانا ہوتا رہا، ہر مرتبہ سوئیزرلینڈ پہلے سے بھی زیادہ ماڈرن لگتا تھا۔ نئی نئی جگہیں ڈیویلپ کرکے انہوں

گورنر سندھ معین الدین حیدر کے این اکیڈمی کے دورے کے موقع پر اپنے تاثرات لکھ رہے ہیں۔
نیچے ان کو شیلڈ پیش کی جارہی ہے محمد الیاس نینی تال والا نمایاں ہیں

نے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ بہت سلیقہ مند قوم ہے یورپ میں ہٹلر بھی سوئس لوگوں سے ڈرتا تھا کیونکہ یہاں ہر مرد کو فوج میں نوکری کرنی پڑتی ہے۔ خواہ وہ کتنا بڑا صنعت کار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ پھر ہر سال تین ہفتے اُس کو لازمی ڈیوٹی دینا ہوتی ہے۔ سوئیزرلینڈ کا ایک حصہ جرمنی دوسرا فرانس تیسرا اٹلی سے ملتا ہے۔ یعنی تین سرحدیں ہیں جن سے یہ ملک گھرا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں جرمن باڈر پر جرمن، فرنچ اور اٹلی کے باڈر پر اٹالین زبان بولی جاتی ہے۔ انگریزی بھی یہاں اضافی زبان ہے البتہ اب سوئیز زبان بھی ایجاد کر لی گئی ہے۔ جو ان تمام چاروں زبانوں کا مرکب کہہ سکتے ہیں۔ اب تو اس ملک کا سکہ تقریباً 43 روپے کے برابر ہو چکا ہے تو آپ پھر اس ملک کی مہنگائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کتنی بڑھ چکی ہوگی۔ اس کی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اگر کسی پہاڑی پر دو مکان بھی بنے ہوں تو وہاں سڑکیں، بجلی، گیس، ٹیلیفون، موبائل سمیت ہر چیز کی سہولت موجود ہوگی۔ خودکار نظام کے تحت اُن دو مکانوں کو پولیس کا تحفظ بھی حاصل ہوگا۔ نفاست تعلیم، خوش لباسی، مدد کا جذبہ یہی اس قوم کے زریں اصول ہیں۔ دنیا کی کامیاب ترین قوموں میں سوئیز باشندے سب سے نمایاں ملیں گے۔ بنک، گھڑیاں، چاکلیٹ ان کا مشہور ترین شعبوں میں درجہ اول کا مقام ہے۔ جس نے سوئیزرلینڈ نہیں دیکھا تو یوں سمجھیں اُس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اگرچہ آبادی کے لحاظ سے تو یہ کراچی سے بھی ایک تہائی ہے۔ یعنی 70,60 لاکھ کی آبادی کا ملک ہے مگر دنیا کی تمام چیزیں یہ ملک بناتا ہے۔ اور ایکسپورٹ بھی کرتا ہے۔ مضبوطی پائیداری ان کا طرّہ امتیاز ہے۔ اگر آپ نے ایک سوئس گھڑی خرید لی تو تمام عمر کے لئے بھی کافی ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ اُس کو صحیح طریقہ سے استعمال میں لائیں۔

جرمنی کا سفر:

یورپ کے سفر کے دوران جرمنی جانا تو لازم ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دیگر یورپین ممالک سے ان

فرانسیسی قونصل جنرل کے ساتھ ایک تقریب میں 2006ء

کی سرحدیں ملتی ہیں۔جرمن جفاکش،محنتی قوم ہے صنعت وحرفت زراعت بڑی بڑی مشینریز جہاز سازی الغرض تمام میدان میں یہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔1970ء میں جب پہلی مرتبہ گیا تھا تو فرینکفرٹ ایئرپورٹ بھی بہت چھوٹا تھا۔یعنی آج کل کے مقابلے میں 10 فیصد حصے پر واقع تھا۔ایک ہی ٹرمینل تھا جرمن مارک صرف ایک روپے کے برابر تھا۔ویزہ بھی ضروری نہیں تھا۔ایئرپورٹ پر صرف واپسی کا ٹکٹ پوچھتے تھے۔اور پاسپورٹ پر مہر بھی نہیں لگاتے تھے۔1978ء تک کوئی خاص کاروباری مراسم نہیں ہوسکے۔سوائے گھومنے گھمانے کے۔ٹکٹ بہت سستے ملتے تھے۔درمیان میں جتنے بھی شہر چاہیں اضافہ کرلیں یعنی اگر کراچی سے لندن کا ٹکٹ لیا ہے۔تو ان کے درمیان آنے والے شہروں میں آپ بغیر اضافی کرایہ ادا کئے سیر کرسکتے تھے۔1978ء میں جب ادویات کے کاروبار سے بڑھ کر کاسمیٹکس کا کاروبار شروع کیا تو سب سے پہلے جرمن کمپنی سے پرفیوم کی خریداری سے ابتداء کی۔ایک جاپانی کمپنی(SIBOLEY) سے معاہدہ کیا۔ایک ماہ کی کاسمیٹکس بنانے کی ٹریننگ لی۔یہ اوساکا شہر سے 50 کلومیٹر دور فیکٹری میں جو(SIBOLEY) جاپانی کمپنی تھی۔پرفیوم اور کریم بنانے والی درمیانی کمپنی۔جاپانی اسٹائل ہوٹل میں جس میں بیڈ کے بجائے ہماری طرح میٹریس پر ہی سونا پڑا جس کی مجھے عادت نہیں تھی۔اور چونکہ بہت چھوٹا سا شہر تھا وہاں انگلش اسٹائل ہوٹل نہیں تھا۔گزارا کرنا پڑا۔فارمولہ جاپانی تھا پرفیوم یورپین اسٹائل جرمنی کی بنی ہوئی تھی۔مگر بہت کوششوں اور پبلسٹی کے باوجود سبولی فرام جاپان کی کاسمیٹکس پاکستانی مارکیٹ میں مقبول نہیں ہوسکی اور ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔جیسا کہ میں نے شروع میں سرسری سا ذکر بھی کیا تھا۔الغرض آج زیادہ پرفیومز جرمنی سے امپورٹ کرتے ہیں۔جرمنی کے جن شہروں میں جانے کا اتفاق رہا اُن میں سرفہرست فرینکفرٹ کے علاوہ ہمبرگ ،اسٹڈگارڈ،میونخ،فرائی برگ،ہالذمنڈن،ڈوزال ڈوف،بون وغیرہ شامل ہیں۔

2002ء میں سوات میں شوٹنگ کے موقع پر

فرانس کا سفر:

جرمنی کی طرح فرانس بھی گیا خصوصاً 1971ء میں پیرس سے ٹولوس شہر گیا۔ اُس شہر کی خصوصیت وہاں جا کر معلوم ہوئی یہاں برٹش فرانسیسی کمپنی مل کر ایک نیا جہاز CONCORD بنانے کا تجربہ کر رہی تھیں۔ غالباً میں پہلا پاکستانی تھا جس نے جہاز کا نکارڈ کی آزمائشی پرواز دیکھی۔ یہ ہمارے کاروباری دوست جو ایک ادویات بنانے والی کمپنی کے مالک تھے بہت بڑے سرمایہ دار تھے۔ اُن کی بہت اپروچ تھی، ریس کورس بھی تھا گھوڑوں کے بہت شوقین تھے۔ نامور گھوڑوں کی ریس میں بھی ان کا بڑا مقام تھا۔ لہذا مجھے وہ ایئرپورٹ لے گئے اور وی آئی پی کی حیثیت سے ہم نے اس انوکھے جہاز کی آزمائشی پروازیں دیکھیں۔ جہاز اترتا تو زمین کانپتی تھی جیٹ انجن تھے آواز سے زیادہ تیز رفتار تھی۔ دراصل یہ پیرس، نیویارک فلائٹ کے لئے بنایا گیا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ جس وقت آپ اس جہاز میں سوار ہونگے۔ ٹھیک اُسی ٹائم آپ نیویارک پہنچ جائیں گے۔ پیرس نیویارک صرف پانچ گھنٹوں میں سفر طے ہوگا۔ اور پھر پیرس نیویارک ٹائم کا فرق بھی پانچ گھنٹوں کا تھا۔ نیویارک پیرس سے پانچ گھنٹے پیچھے تھا۔ صرف ایک ہی کلاس جہاز میں آپریٹ ہوتی تھی۔ کرایہ فرسٹ کلاس کا چارج ہونا تھا۔ یہ معلومات ہمارے دوست نے ایئرپورٹ پر بریفنگ دی تھی۔ ٹولوس شہر ہمارے حیدرآباد سے بھی چھوٹا تھا۔ اگر آپ شہر سے ائرپورٹ جائیں گے تو آپ کو آنے جانے کا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ آزمائشی ائرپورٹ زیادہ تھا۔ عوامی جہاز کم ہی اترتے تھے۔ اسی وجہ سے ٹیکسی ڈرائیور ڈبل کرایہ چارج کرتے تھے۔ دوسرے دن ہمارے دوست نے ہم سے پوچھا کہ آپ کو گھوڑے کی سواری کا شوق ہے۔ ہم نے سوچا اگر ہم نے نہیں کہا تو وہ کیا سمجھے گا۔ ہماری عمر صرف 27 سال تھی۔ کسرتی جسم تھا خود کرکٹ بیڈمنٹن ٹیبل ٹینس، جو اسکول اور کالج کے دوران کھیلتے تھے سوچا چلو گھوڑے کی بھی سواری کر لیتے ہیں۔ ایک آدھ مرتبہ مری میں گھڑ سواری کی تھی مگر کوچوان کے ساتھ، اُس دوست نے دوسرے دن صبح 6 بجے گھڑ

معین الدین حیدر کے این اکیڈمی کے دورے کے موقع پر

کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی کو خلیل نینی تال والا اپنی کتاب گردشِ ایام پیش کر رہے ہیں

سواری کی تجویز دی ہم نے حامی بھرلی۔ دوسرے دن صبح وہ ہمارے ہوٹل پر آ کر مجھے اپنے ریس کورس میں لے گئے۔ گھوڑا تو ریس کورس کا تھا۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ گھوڑا بہت تیز رفتار ثابت ہوگا۔ اللہ کا نام لے کر اُس کے سائیس نے سوار کرادیا۔ مجھے تو گھڑ سواری آتی نہیں تھی۔ گھوڑے پر سوار تو ہوگیا۔ گھوڑے نے دوڑنا شروع کیا بہت کوشش کی مگر گھوڑا تیز دوڑنے لگا تو میں نے نزدیک ہی ساتھ دوڑنے والے گھڑسوار سے انگریزی میں کہا کہ میری مدد کرو یعنی Help me ,Help me فرانس میں لوگ انگریزی نہیں جانتے اُن کو اپنی فرانسیسی زبان پر بہت فخر ہے بلکہ انگریزی زبان بولنا پسند بھی نہیں کرتے۔ چونکہ میں بہت گھبرایا ہوا تھا اور گھوڑا مجھے اُچھال رہا تھا میں نے لگام مضبوطی سے پکڑ رکھی تھیں وہ سمجھا میں گھوڑے سے کھیل رہا ہوں وہ ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر میں اور گھبرا گیا اب گھوڑا بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو ریس کورس کے سنہرے والے باڑ میں موڑ کر روکنے کی کوشش کی میری خوش قسمتی ایک گھڑ سوار جو انگریزی جانتا تھا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ میں اناڑی ہوں اور گھوڑے کو نہیں سنبھال سکتا تو اُس نے آگے آ کر میرے گھوڑے کی لگام تھام کر دوڑتے ہوئے گھوڑے کو روک کر مجھ سے پوچھا کیا پرابلم ہے۔ میں نے کہا گھوڑا میرے قابو سے باہر ہے اُس کو روک کر مجھے واپس پویلین تک لے چلو۔ اُس دوران آدھا ریس کورس میں پار کر چکا تھا۔ اُس کو بڑا تعجب ہوا جب پویلین میں مجھے اُس نے گھوڑے سے اتارا اور میں نے بتایا میں آج تک ریس کورس کے گھوڑے پر کبھی نہیں بیٹھا، اُس نے اور اُسی گھوڑے کے مالک نے بڑے ہی تعجب سے کہا تم بہت خوش قسمت ہو یہ گھوڑا تو بہت تیز دوڑنے والا گھوڑا تھا میں سمجھا تم ایسے گھوڑوں کی سواری کر چکے ہوگے۔ اس لئے میں نے تم کو یہ سب سے تیز دوڑنے والا گھوڑا دیا تھا۔ مگر تم نے کیسے اس گھوڑے کو قابو کیا۔ یہ تمہارا ہی کمال ہے۔ آئندہ ایسی غلطی نہ دہرانا، گھوڑے سے اُتر کر میں نے سکون کا سانس کیا لیا جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہو۔ الغرض دو دن بعد ٹولوس سے پیرس چلا گیا۔ پھر 1979ء میں فرانس آیا۔ اس مرتبہ اپنی بچی کمپنی

ڈاکٹر قدیر خان کے این اکیڈمی کے دورے پر

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے این اکیڈمی کے دورے کے موقع پر اُن کو شیلڈ پیش کی جارہی ہے جنید خلیل، خرم خلیل اور پرنسپل الماس طارق نمایاں ہیں

کے لئے پرفیوم کی خریداری کیلئے نیز (Nice) آیا یہاں گراس (Grass) کے شہر میں پرفیوم کی بہت سی کمپنیاں ہیں۔یہیں سے میں نے ٹچ می ٹالک کیلئے پرفیوم پسند کی اللہ کی مہربانی سے وہ خوشبو اتنی پسند کی گئی کہ تمام ٹالکم پاؤڈر میں پاکستان کی تاریخ میں سپرہٹ ہوگئی۔اور ٹچ می ٹالکم پاؤڈر مارکیٹ میں نمبر 1 کی پوزیشن حاصل کر کے صرف دوسال کے قلیل عرصہ میں چھا گیا۔یہی پرفیوم میں نے ٹچ می شیونگ کریم میں استعمال کی یہ ایک انوکھا تجربہ تھا کیونکہ یہ خواتین کی پرفیوم تھی۔آج تک شیونگ کریم میں مردانہ پرفیوم استعمال کی جاتی ہے مگر میں نے ایک نیا تجربہ کیا کہ صبح صبح مردوں والی خوشبو کی بجائے بھینی بھینی Floral خوشبو بہتر ثابت ہوسکتی ہے۔الحمدللہ وہی ہوا یہ خوشبو بھی عوام نے اتنی پسند کی آج 25 سال گزرنے کے باوجود ٹچ می شیونگ کریم کے خریدار اُس کو بہت پسند کرتے ہیں۔اور وہ بھی پاکستان میں سب سے زیادہ بکتی ہے۔فرانس میں ایک رات مجھے دانت میں سخت درد ہوا۔اتفاق سے صبح اتوار تھا تمام ڈینٹسٹ کلینک بند ہوتے ہیں۔میرے میزبان کا بیٹا اتفاق سے ڈینٹسٹ تھا۔اُس نے میرے دانتوں کو صاف کر کے ایک ٹوتھ پیسٹ تجویز کیا جو بہت ہی کڑوا تھا۔میں نے جب اُس ٹوتھ پیسٹ کو صبح استعمال کیا تو مجھے الٹی آ گئی اور میں نے تھوک دیا۔مگر چونکہ ڈاکٹر نے دن میں تین بار استعمال کرنے کے لئے کہا تھا۔تو میں نے مجبوراً تین مرتبہ استعمال کیا۔پاکستان میں بھی اکثر یہ تکلیف ہوتی رہتی تھی تو میں نے ایک درجن ٹوتھ پیسٹ خرید لئے۔ایک ہفتے میں میرے دانت سے خون آنا بھی بند ہوگیا اور درد بھی ختم ہوگیا تو میں نے سوچا کیوں نہ یہ ٹوتھ پیسٹ پاکستان میں متعارف کرایا جائے۔اُس وقت تک ہم نے نیچرل ٹوتھ پیسٹ مارکیٹ کر دیا تھا۔جو کافی مقبول ہو چکا تھا اُس ٹوتھ پیسٹ کو متعارف کرانے کیلئے ہم نے سوئیز رلینڈ کی کمپنی کو خط لکھا اُس کا جواب بہت ہی تضحیک آمیز تھا کہ ہم پاکستان جیسی چھوٹی مارکیٹ میں اس ٹوتھ پیسٹ کو نہیں متعارف کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔مجھے اُس کمپنی کا جواب بہت ہی بُرا لگا۔چنانچہ اس کو چیلنج سمجھ کر میں نے اُس ٹوتھ پیسٹ کو اپنی چاس اے

وفاقی وزیر معین الدین حیدر کے این اکیڈمی کا دورہ کر رہے ہیں

مینڈوزا لیبارٹری میں ٹیسٹ کروا کر فارمولے کو(DISCOVER) حاصل تو کر لیا مگر صحیح مقدار کا پھر بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔اور سب سے زیادہ ناپسندیدہ اس کی کڑواہٹ اور اس کا بدذائقہ ہونا تھا جسے دور کرنا ضروری تھا۔الحمدللہ صرف تین ماہ کی کوششوں سے نہ صرف ہم نے صحیح فارمولہ نکال لیا بلکہ اُس کی کڑواہٹ بھی ختم کر لی اور اس نئے میڈیکیٹڈ ٹوتھ پیسٹ کو میڈی کیمMEDICAM کے نام سے متعارف کروایا۔میڈی کیم کا نام خود میں نے تجویز کیا یہ میڈی سے مُراد میڈیکیٹڈ اور کیم سےCAM سے چاس اے مینڈوزا کا مخفف نام بنتا ہے۔اس ٹوتھ پیسٹ کو شروع میں صرف ڈاکٹر صاحبان کے ذریعے ہم نے متعارف کروایا۔مگر ہمارے ڈاکٹروں نے اُس کو خاطر توجہ نہیں سمجھا اُن کے خیال میں غیر ملکی میڈیکیٹڈ ٹوتھ پیسٹ ہی اچھے ہوتے ہیں۔ایک پاکستانی کمپنی چاس اے مینڈوزا اچھا ٹوتھ پیسٹ بنانے کی اہلیت نہیں رکھتی بلکہ ڈاکٹروں کو جب ہم نے دعوے کے ساتھ یہ کہا کہ یہ ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے سے دانتوں سے خون آنا اور درد ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔جب تک یہ مریض استعمال کرتا رہے گا۔انہوں نے مذاقاً کہا کہ تو ہمارے کلینک میں پھر یہ مریض واپس کیوں آئیں گے ۔ایسا ٹوتھ پیسٹ ہم مریض کو دے کر ہمیشہ کے لئے اُس مریض سے محروم ہو جائیں گے ۔ہم یہ Prescribe نہیں کریں گے۔اور ایسا ہی ہوا ڈاکٹر صاحبان ہمارے سیمپل تو لے لیتے تھے مگر اکثر مریضوں کو استعمال کرنے کا مشورہ نہیں دیتے تھے تو مجبوراً مجھے فیصلہ کرنا پڑا کہ میڈی کیم کو عوام سے متعارف کرانے کے لئے ٹی وی اور اخبارات کا سہارا لیا جائے۔جب ہم نے اخبارات اور ٹی وی سے میڈی کیم کو متعارف کرانا شروع کیا تو اس ٹوتھ پیسٹ نے جادوئی اثر دکھایا جیسا کہ میرے ساتھ فرانس میں پہلے ہی پیش آچکا تھا۔آج الحمدللہ میڈی کیم غیر ملکی ٹوتھ پیسٹوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ مقبول اور بکنے والا پاکستانی ٹوتھ پیسٹ بن چکا ہے گویا فرانس کے سفر سے مجھے میڈی کیم ٹوتھ پیسٹ بنانے کا موقعہ ملا۔جو ہماری کمپنی کی تاریخ میں سب سے سُنہرا باب بن کر طلوع ہوا۔اور آج ہم اسے

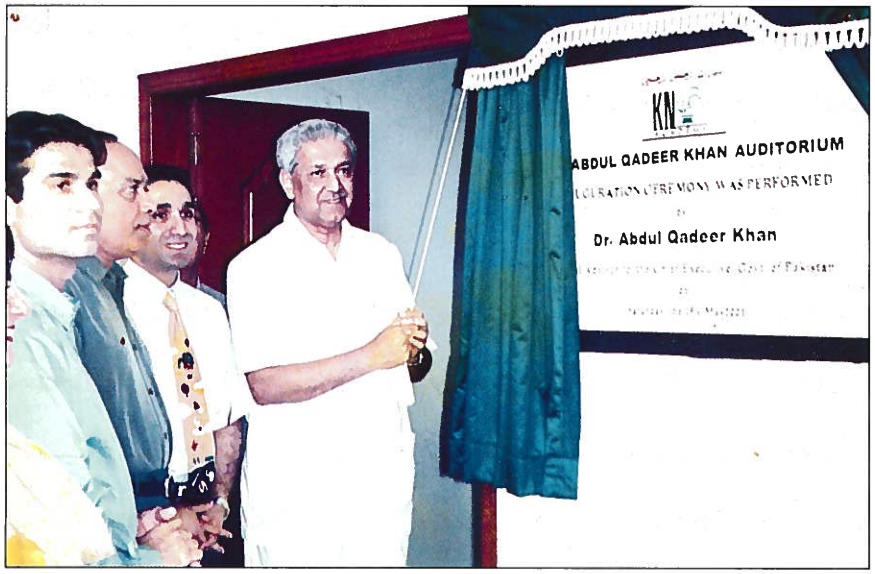

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے این اکیڈمی کے دورے کے موقع پر آڈیٹوریم کی نقاب کشائی کر رہے ہیں،
کے این اکیڈمی کے سوئمنگ کلب کا دورہ کر رہے ہیں

میڈی کیم کے بنائے ہوئے ٹوتھ پیسٹ کریم، ہیر کلر، شیمپو بہت فخر سے کہتے ہیں کہ پاکستانی پروڈکٹس اب غیر ملکی کمپنیوں سے معیار میں کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں اور قیمتوں میں بھی کم ہیں جس پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں۔

بھارت کا پہلا سفر:

جب ہندوستان کا ویزہ ملنا شروع ہوا تو میں نے سوچا اب ہندوستان کا سفر بھی شروع کیا جائے۔ میں اپنے ایک دوست جو میرے کزن بھی تھے اُن کے ساتھ بمبئی گیا اُن کا نام شفیع فیروز تھا۔ بمبئی میں ہمارے میزبان (اُس زمانے میں غالباً 1988ء کا سال تھا۔) بمبئی کی بہت بڑی فارماسیوٹیکل کمپنی کے مالک راجو دیہوراء تھے اُن سے ہمارے کاروباری معاملات تھے۔ بمبئی سے تفریح کے لئے کھنڈالہ جو بمبئی سے کافی دور پہاڑی علاقہ تھا جہاں ہمارے قائداعظم محمد علی جناح بھی رہائش پذیر رہے تھے۔ جس کا نام جناح ہاؤس تھا جس دن ہم وہاں پہنچے تو پاکستان اور بھارت کا کرکٹ میچ آرہا تھا جو حیدرآباد پاکستان کا پانچ روزہ میچ تھا۔ جس میں ہمارے ہیرو جاوید میاں داد اور مدثر نذر کی اہم پارٹنر شپ دکھائی جارہی تھی۔ مگر بھارتی عوام اُس پارٹنر شپ کو توڑنے کیلئے پوری کوشش کر چکے تھے۔ مگر صرف چند منٹ اُسی دن کے میچ ختم ہونے سے پہلے مدثر نذر آؤٹ ہو گئے اُس وقت جاوید میاں داد 280 پر کھیل رہے تھے تو امید بندھی تھی کہ عمران خان جو اُس وقت پاکستان ٹیم کے کپتان تھے جاوید میاں داد کو صرف آدھے گھنٹے ضرور کھیلنے دیں گے تاکہ پاکستان کا یہ کھلاڑی بھی چند منٹ میں 300 رنز بنالیگا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ صبح عمران خان نے اننگ ڈیکلیئر کردی۔ جو جاوید میاں داد کے لئے یقیناً صدمہ تو تھا مگر پاکستان کے لئے ایک اعزاز بھی ختم ہو گیا۔ کاش عمران خان ایسا فیصلہ نہ کرتے کیونکہ تین دن کرکٹ کے باقی تھے۔ جہاں وہ پاکستان کو جتوا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا فیصلہ کیا کہ نہ ہماری

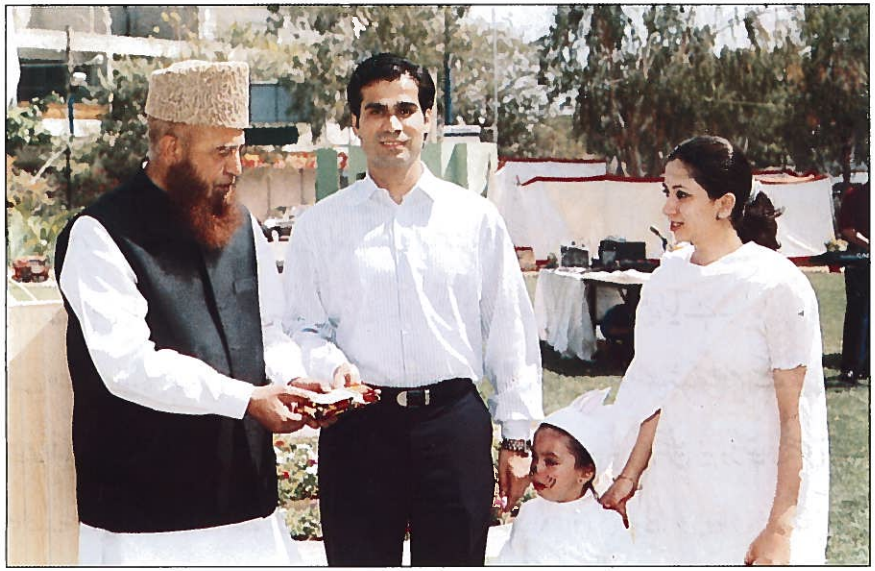

سالانہ تقریب کے این اکیڈمی بہادر آباد میں جنید خلیل کے ساتھ بے بی یشعل سلمان۔

قومی اسمبلی کے اراکین کے این اکیڈمی کا دورہ کر رہے ہیں

قوم آج تک سمجھ سکی اور نہ ہی جاوید میاں داد اس واقع کو اپنی کرکٹ کی زندگی سے بھلا سکے۔ بھارت میں جہاں بہت ہی زندگی کے ابھار دیکھے مگر ایک بات جو میں نے محسوس کی کہ بھارتی عوام پاکستان سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں اور اسی طرح پاکستانی عوام بھی بھارتی عوام سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اگر چہ بھارتی اور ہماری حکومت آپس میں ایک دوسرے سے محبت کے بجائے نفرت کی پالیسی رکھتے ہیں ۔دونوں بڑے دعوے تو کرتے ہیں۔ یہ میں نے کئی مرتبہ بھارت جا کر خود دیکھ لیا ہے۔ اگر آپ کسی بھی ملک کا ویزہ لیتے ہیں علاوہ سعودی عرب تو آپ اُس ملک میں بغیر کسی رکاوٹ کے گھوم سکتے ہیں۔ مگر بھارت میں آپ کو جس شہر میں جانا ہوتا ہے تو آپ کو اُسی شہر کا ویزہ ملتا ہے۔ اور اگر آپ بغیر بتائے دوسرے شہر میں گئے تو وہاں کی پولیس آپ کو گرفتار کر کے جیل بھیج سکتی ہے۔ اور آپ کو سزا بھی ہو سکتی ہے اس لئے بھارت آپ جس جس شہر کے ویزے لیتے ہیں آپ انہیں شہروں تک محدود رہ سکتے ہیں۔ پھر اس دورے کے بعد کئی مرتبہ نینی تال، گوا، دھلی، آگرہ جا کر بھارت میں مسلمان، عیسائی، ہندو تہذیب کا بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مگر بھارتی عوام خواہ ہندو ہوں یا مسلمان وہ بھارتی قومیت کے پرستار ہیں۔ خصوصًا ہندو تو واقعی ہندوستانی ہیں وہ ہر طرح اپنے آپ کو ہندوستانی ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ دل میں وہ پاکستانیوں کیلئے جو بھی محسوس کریں مگر اندرونی طور پر پاکستانی اشیاء کو خریدنے سے گریز کرتے ہیں۔ اُن کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بھارتی اشیاء خریدیں۔ ہم پاکستانی ایسی تفریق نہیں کرتے مگر ان کے قومی جذبے کو بہر حال ہمیں ماننا پڑے گا یہی وجہ تھی مجھے بار بار بھارت جانے کے باوجود اُن کی پاکستان سے غیر فطری دوری پسند نہیں آئی۔ مگر شاباش کہ وہ ہماری طرح کھل کر بات نہیں کرتے مگر دل ہی دل میں اپنا کام دکھا جاتے ہیں۔ وہ اگر لاہور آئیں گے تو بڑی ہی خوش دلی سے کہیں گے ہم پاکستان سے دوستی چاہتے ہیں مگر جب اُن کی حکومت کوئی سیاسی بیان جاری کرتی ہے تو اُس کا رویہ کچھ اور ہوتا ہے اگر بھارت میں کوئی حادثہ ہو جائے تو فورًا پاکستان پر الزام آجاتا ہے۔ خواہ

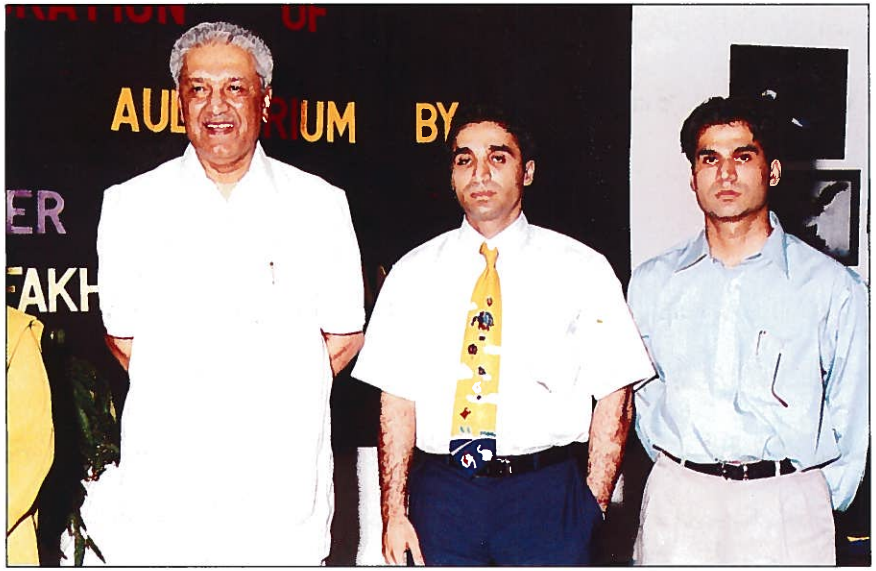

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے این اکیڈمی کا ماڈل دیکھ رہے ہیں

وہ بمبئی میں یا دلی میں ہو تو فوراً آئی ایس آئی پر الزام آجاتا ہے اور میرا خیال ہے ہماری حکومت بھی جب پاکستان میں کوئی حادثہ ہوتا ہے تو وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے بھارت کے "را" پر الزام لگا کر اپنی جان چھڑا لیتی ہے۔ مگر آج تک نہ "را" نے آئی ایس آئی پر یا ہماری پاکستانی آئی ایس آئی نے بھارتی را پر ملوث ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ مگر ایک بات بہت صاف ہے کہ بھارتی عوام اور پاکستانی عوام ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور وہ اس دوری کو ختم کرنے کے لئے اپنی اپنی حکومتوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں جبکہ ہمارے سیاست دان اُن کے جذبات سے کھیلتے رہتے ہیں اور آج تک کھیل رہے ہیں تا کہ اُن کی سیاست چمکتی رہے مگر ایک دن یہ سیاست ختم ہو جائے گی۔ اور ہماری عوام پاکستان اور بھارت میں ایک دوسرے سے آسانی سے مل سکیں گے۔

سری لنکا کا دورہ:

پاکستان کے بعد سری لنکا وہ چند واحد ملکوں میں شامل ہے جہاں ہم کو ویزہ کی ضرورت نہیں ہے حالانکہ سری لنکن کو ہمارے ملک میں آنے کے لئے ویزے کی ضرورت ہے، میں تقریباً بیس سال تک سری لنکا آتا جاتا رہا۔ سری لنکا کا سب سے بڑا ذریعہ معاش ٹورزم ہے۔ یعنی سمندری سیّاح تمام ممالک سے سری لنکا آتے ہیں۔ بہت ہی سستا ملک ہے اور پھر وہاں کے عوام بہت ہی خوش اخلاق ہیں۔ ہوٹل ،خوراک ،ٹرانسپورٹ بہت ہی آسان اور سستا ہے ہر شہر کے ساتھ تقریباً سمندر اور ہوٹلوں کا وسیع جال ہے۔ البتہ ایک چیز جو سری لنکا کی ترقی میں رکاوٹ ہے وہ تامل ٹائیگروں کی جنگ ہے جو گزشتہ بیس تیس سال سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے جاری ہے یہ سری لنکا میں رہنے کے باوجود اس کے شہری تو ہیں مگر ان کو سری لنکا میں ووٹ کا حق حاصل نہیں ہے۔ بھارت ان کی تحریک کو ہمیشہ ہوا دیتا رہا ہے۔ وہی ان کو ہتھیار، پیسہ اور پناہ دیتا رہا ہے ان کے باشندے مدراس اور اس کے نواح میں پناہ لیتے

جاپان کے 2003ء کے دورے کے موقع پر

رہے ہیں۔سری لنکا کی دوسری سب سے بڑی ایکسپورٹ چائے ہے۔کینڈی شہر تو چائے کے باغات سے بھرا پڑا ہے۔یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جہاں بکثرت بارش ہوتی ہے۔تقریباً چالیس سال کی ٹریولنگ میں مجھے صرف ایک مرتبہ جوتوں کی چوری کا حادثہ کولمبو سے مالدیپ جاتے ہوئے پیش آیا ۔میں نے اپنا جوتا جو بالی برانڈ کا سوئیزرلینڈ کا بنا ہوا تھا وہ کھلے بیگ میں اُتار کر نائیکی NIKE کے اسپورٹ جوتے سے تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔مگر جب میں مالدیپ پہنچا تو مجھے تعجب ہوا کہ میرا BALEY کا جوتا غائب تھا اور اُس کی جگہ ایک معمولی کالا ربڑ کا جوتا رکھا ہوا تھا۔ایسا جوتا عام طور پر ہوٹل کے معمولی ورکر استعمال کرتے ہیں۔سری لنکا سے روانگی کے وقت انہوں نے میرا BALEY کا جوتا نکال کر اپنا استعمال شدہ معمولی جوتا رکھ دیا یہ غیر معمولی واقعہ میری زندگی میں بھی یادگار بن گیا۔مگر سری لنکا کے لئے اچھے اور خوش گوار تاثرات کے بجائے ایک بُرا تاثر چھوڑ گیا گویا سری لنکن جوتے بھی نہیں چھوڑتے اس کے بعد میں جب بھی سری لنکا گیا ہر چیز کی حفاظت کی اور عوام کیلئے بھی اچھی رائے نہیں رکھی۔میرے نزدیک ایک Five Star ہوٹل کے ملازمین اگر ایسی حرکت کریں۔تو عام ہوٹلوں میں کیا ہوتا ہوگا۔یہی تاثر مجھے سری لنکا کے اس واقعے سے سری لنکن کے لئے قائم ہوگیا۔حالانکہ سری لنکن کرکٹ کے کھلاڑی بہت ہی ڈسپلن کھلاڑی مانے جاتے ہیں۔دراصل مجھے جوتے کے تبدیل ہونے کا اتنا دُکھ نہیں تھا۔مگر مالدیپ میں مجھے صرف تین دن رکنا تھا پھر وہاں سے انڈونیشیا جانا تھا اور ایسا جوتا مالدیپ میں نہیں ملتا تھا مجبوراً مجھے NIKE کے جوتے میں انڈونیشیا جانا پڑا اور پھر میں نے وہاں جا کر ایسا کاروباری جوتا خریدا۔

مالدیپ:

سری لنکا سے ہماری فیملی مالدیپ روانہ ہوئی جیسا کہ میں نے سری لنکا میں جوتا چوری ہونے کا واقعہ لکھا

U-19 ورلڈ کپ جیتنے والوں کو انعام دے رہے ہیں

تھا۔ مالدیپ دراصل 2000 سے زائد جزائر ISLAND پر مشتمل مسلمان ملک ہے اور ہر جزیرہ پر ایک دو ہوٹل واقع ہیں بہت خوبصورت جزیرے ہیں بہت مناسب داموں میں ہوٹل کرائے پر مل جاتے ہیں۔ یہاں صرف شراب لانے کی ممانعت ہے مگر ہر ہوٹل میں بہت ہی مہنگے داموں میں شراب مل جاتی ہے غالباً حکومت نے ٹورسٹوں (سیاحوں) کو سستے دام ہوٹل اور کھانے فراہم کر کے اس کی کسر شراب کے بہت ہی مہنگے داموں میں فراہم کر کے غیر ملکی کرنسی کمانے کا آسان راستہ دریافت کرلیا ہے ائرپورٹ پر سیاحوں سے صرف ایک ہی سوال کیا جاتا ہے کیا آپ کے پاس شراب ہے اگر آپ نے کہا ہاں تو کسٹم کا عملہ فوراً وہ بوتل اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ اگر آپ نے کہا کہ نہیں اور شراب کی بوتل تلاشی میں نکل آئے تو وہ بوتل قابل ضبط ہو جاتی ہے جبکہ ہاں کی صورت میں وہ آپ کو آپکی بوتل جاتے ہوئے واپس کر دیتے ہیں۔ یہاں آپ مچھلی کا شکار بوٹ میں کر سکتے ہیں۔ اگرچہ بہت ہی چھوٹا ملک ہے مگر سیاحوں کے لئے بہت یادگار ٹورسٹ ریسٹ ہاؤس ہے۔ وہاں آپ کو بہت ہی سستی تفریح ملے گی اور عوام بھی بہت خوش اخلاق ہیں اگرچہ غربت بھی بہت نمایاں ہے۔ سمندر بہت صاف ستھرا ہے۔

یورپی ممالک:

اپنی سفری زندگی کے آغاز میں بیلجیئم، ہالینڈ، ڈنمارک، سوئیزرلینڈ، اٹلی، نیدرلینڈ جانے کا اتفاق رہا یہ محض ایک سفری تجربے تو تھے مگر وہاں کوئی خاص کاروباری منافع بخش واقعہ نہیں ہوا۔ ماسوائے چند دن گزارنے کے بعد اگلے سفر پر روانہ ہو جانا اور چونکہ یہ ممالک ایک دوسرے سے بہت ہی ملے ہوئے ہیں۔ لہذا ٹرین اور کار سے ان کا سفر بہت ہی آسان ہوتا تھا۔ چونکہ اُس زمانے میں ویزے کی سہولیات تھیں تو ان میں آنا جانا اتنا ہی آسان ہوتا تھا جیسے یہ ایک ہی ملک کے حصے ہوں اب جبکہ ویزے کا حصول بہت ہی مشکل بنا دیا گیا ہے تو اب یہ خیال خام ہے۔ آپ ایک دوسرے ملک میں اس

عبدالقدیر خان کے استقبال کا منظر

طرح سفر نہیں کر سکتے ہیں۔ البتہ یورپی یونین کے ملنے کے بعد ان ممالک میں شینگین ویزہ بھی مروج ہے (ان یورپین ممالک کا مشترکہ ویزہ) اگر آپ کو مل جائے تو آپ ان بیس، پچیس ممالک میں سفر کر سکتے ہیں البتہ سوئیز رلینڈ کا ویزہ آپ کو الگ حاصل کرنا پڑے گا۔ سوئیز رلینڈ ان ممالک میں سب سے نمایاں ہے اس ملک میں پہاڑ، دریا اتنے بہتات سے پائے جاتے ہیں گویا جنت کا گمان ہوتا ہے۔ بہت ہی صاف ستھرا ملک ہے البتہ مہنگائی کے معاملے میں یہ یورپ میں سب سے آگے ہے اگر یورپ میں سوئیز رلینڈ نہیں دیکھا تو سمجھیں آپ نے یورپ ہی نہیں دیکھا۔

ہنگری کا سفر:

زندگی میں صرف ایک مرتبہ ھنگری جانے کا اتفاق ہوا۔ ترکی سے ہنگری کے شہر بوڈا پیسٹ BUDAPEST جا رہا تھا۔ آدھی رات یعنی 12 بجے کا وقت تھا جہاز کے کپتان نے اعلان کیا ہم بخا ریسٹ BUKHA REST یعنی رومانیہ کے شہر میں اتر رہے ہیں۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھا اور بخا ریسٹ کے ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ جب ایئرپورٹ پر ایمیگریشن کاؤنٹر پر پہنچا تو اُس نے کہا تمہارے پاس رومانیہ کا ویزہ نہیں ہے تم کیسے آ گئے میں نے کہا مجھے تو ھنگری کے شہر بوڈا پیسٹ جانا ہے۔ اُس نے پولیس کو آواز دی کہ اس بندے کو فوراً جہاز پر چڑھاؤ یہ غالباً 1974ء کا واقعہ ہے جو مجھے یاد رہ گیا۔ اُس پولیس والے نے مجھے بھگا کر واپس جہاز پر چڑھایا غالباً اُس نے واکی ٹاکی سے جہاز کو بھی رکوایا تھا۔ کیونکہ جب میں واپس جہاز میں پہنچا تو اُس کی ایئر ہوسٹس کافی ناراض لگ رہی تھی اُس نے شکایتً کہا کہ تم کیوں اتر گئے تھے ہم ایک مسافر کم ہونے کی وجہ سے پریشان تھے اور دوسرا واقعہ ھنگری ہی میں پیش آیا کہ میری فلائٹ جو صبح 7 بجے تھی میرے میزبان کے نہ آنے پر چھوٹ گئی وہ بے چارہ 7 بجے ہوٹل پہنچا جبکہ فلائٹ کا ٹائم 7 بجے تھا وہ مجھے لے کر ایئرپورٹ گیا اور 11 بجے دوسری فلائٹ

گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد شیلڈ دے رہے ہیں

گورنر سندھ عشرت العباد خلیل احمد نینی تال والا سے مصافحہ کر رہے ہیں

سے اُس نے آسٹریا یعنی VIEANA روانہ کیا بس میری زندگی کی یہ واحد فلائٹ تھی جو میں اپنے میزبان کی وجہ سے نہیں پکڑ سکا۔ اس کا بھی مجھے قلق ہے ایسا واحد واقع میری زندگی میں کیوں ہوا۔

تائیوان کوریا کا سفر:

پاکستان کی حکومت تائیوان کو نہیں مانتی مگر تائیوان والے ہر ملک سے تجارت کرتے ہیں چونکہ تائیوان چائنا کا حصہ تھا اور پاکستان کا چائنا سے بہت ہی برادرانہ تعلقات ہیں اور تائیوان امریکہ کا حصہ دار ہے جس نے چائنا سے الگ کر کے ایک آزاد ملک بنا دیا ہے اس وجہ سے وہ پاکستان سے اچھے تعلقات کی توقع نہیں کرتے مگر تائیوان سے پاکستان بہت مال آتا ہے۔ لہذا وہ ہر پاکستانی کو تائیوان کا ویزہ دے دیتے ہیں تا کہ اُس کا کاروبار چل سکے، تائیوان کے ویزے کے لئے ہانگ کانگ میں اُس کے دفتر سے ویزہ ملتا ہے اور مقامی تائیوانی کا ویزے پر گرانٹی دینا ضروری ہے کہ وہ اس پاکستانی کا نہ صرف دیکھ بھال کرے گا بلکہ واپس بھی جانے کی ذمہ داری لے گا۔ صرف تین مرتبہ تائیوان جانے کا اتفاق ہوا اور اسی طرح صرف تین ہی مرتبہ کوریا (جنوبی) جانے کا اتفاق رہا۔ دونوں ہی کاروباری ممالک ہیں ۔ جاپان کی طرز پر ہر مشین کا ستانعم البدل بنانے میں ماہر ہیں۔ ہانگ کانگ کی طرح غیر معیاری نہیں بناتے البتہ مہنگے داموں پر بناتے ہیں جس طرح جاپان کی مشینیں دیرپا ہوتی ہے ان کی مشینیں بھی دیرپا ہوتی ہے یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔

صومالی لینڈ، جبوتی، ایتھوپیا:

2005ء میں صومالی لینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے ایک مسلمان دوست عثمان جو دبئی میں رہتے تھے۔ انہوں نے صومالی لینڈ جس کے وہ باشندے تھے کہا کہ یہ ایک مسلمان ملک ہے۔ صومالیہ سے

پاکستان کی ہاکی ٹیم جس نے ہاکی ورلڈ کپ جیتا خلیل نجی تال والا کے ساتھ جنید خلیل خرم خلیل نجی تال والا گروپ فوٹو کرنل مدثر نمایاں ہیں

الگ ہو کر صومالی لینڈ بن چکا ہے مگر کوئی بھی ملک اس کو تسلیم نہیں کر رہا ہے۔ بہت غریب ملک ہے اس کی مدد کی جائے تو اُس کے معدنیات اور سمندری ذخائر اتنے زیادہ ہیں کہ آگے چل کر یہ ملک بھی مالا مال ہوسکتا ہے چنانچہ ہم بھی سیاحت کے شوق میں دبئی سے روانہ ہوگئے۔ دبئی سے ایتھوپیا کے ذریعے صومالی لینڈ کے شہر ہرگیسا پہنچ گئے۔ وہاں عثمان نے ہم کو صومالی لینڈ کے صدر سے ملوایا بہت ہی سادہ طبعیت صدر نے بہت متاثر کیا، معمولی شہر تھا غربت بھی بہت تھی کھیتی باڑی مویشی پالنا بس یہی صومالی لینڈ کی اہم آمدنی کا ذریعہ تھا۔ صومالی لینڈ کے صدر کی سادگی دل میں اتر گئی بہت ہی عام سے گھر میں رہائش اور عام سادہ زندگی۔ بغیر پروٹوکول اس زمانے میں ناممکن ہے جو میں نے اُن سے مل کر محسوس کیا۔ رات کے کھانے پر بغیر پروکوٹول کھانا کھایا، اور میرے صاحبزادے سلمان خلیل کو انہوں نے بخوشی کونسل جنرل اعزازی نامزد کردیا۔ اگرچہ سفر بہت کٹھن ہے جبوتی یا ادیس ابابا سے بہت ہی چھوٹے اور پرانے جہازوں میں سفر کر کے صومالی لینڈ کے شہر ہرگیسا جانا پڑتا ہے۔ مگر میرے خیال میں آنے والے سالوں میں صومالی لینڈ جو صومالیہ سے الگ ہو کر صومالی لینڈ بن چکا ہے۔ اور یو این او جو آج اس کو تسلیم نہیں کر رہی ہے مگر آنے والے کل میں یہ بھی بہت زرخیز ملک ثابت ہوگا۔ اس ملک میں بہت قیمتی دھاتیں، زمرد کے علاوہ سمندری ذخائر مچھلی، جھینگے لابسٹر موجود ہیں۔ اگر کسی بھی اچھی فشری کرنے والے کمپنی نے اس پر ہاتھ رکھا تو بہت جلد یہ ترقی کر کے جبوتی سے بھی آگے آجائے گا۔ جبکہ جبوتی کی صرف ذرائع آمدنی سمندری بندرگاہ کا استعمال ہے جو صومالیہ اور ایتھوپیا کے ذریعہ قائم ہے ایک خاص بات جو ان ممالک میں عام ہے۔ وہ گھاس کی بنی ہوئی ایک بوٹی سب کھاتے ہیں جسے چاڈ کہتے ہیں۔ جس طرح ہم پان کھاتے ہیں یہ دوپہر ایک بجے سے 5 بجے تک زمین پر بیٹھ کر چباتے ہیں۔ یہ ایتھوپیا میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا نشہ بقول ان کے حرام نہیں ہے صرف سکون دیتا ہے جو صدر سے لے کر ایک معمولی انسان کھا کر سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ بالکل ایک عام کھانوں کی طرح

کے سی سی آئی اے کے تحت میڈی کیم انڈر 19 کی فاتح ٹیم کو انعامات دے رہے ہیں

فروخت ہوتی ہے۔جوصومالی لینڈ،جبوتی،صومالیہ،یمن اوراس سے ملحقہ ممالک میں بہت مقبول ہے۔

مصر:

2006ء میں مصر جانے کا اتفاق ہوا،دریائے نیل پر قاہرہ کے ھلٹن ہوٹل پر رہائش تھی۔بہت ہی خوبصورت یادگار تفریح تھی۔نیچے دریا بہہ رہا تھا جہاں فرعون غرق ہوا تھا۔دو دن تک قاہرہ کا دورہ رہا اس میں وہPYRAMIDSاور قاہرہ کے میوزیم کا دورہ کافی معلوماتی تھا۔فرعون کی ممی اور اونچا پہاڑی سلسلہ۔PYRAMIDSدیکھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔یہاں سے ایک شہر جسکوشرم الشیخ کہتے ہیں وہ بھی دیکھنے کا موقع ملا،بالکل بیروت کی طرز پر یہ شہر آباد کیا گیا ہے۔اس میں نائٹ کلب ہی کلب ہیں دراصل عیاشی کی بندرگاہ ہے نوجوان لڑکیاں ڈانسر ہیں کھلیBOATSپر آپ تمام دن رات تفریح کر سکتے ہیں۔سیاحوں کی جنت کی مثال یہ ہے کہ آپ صرف 100 ڈالر میں تمام دن ہوٹل میں رہ کر کھانا پینا اور ڈانس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔ہر ہوٹل میں چار پانچ سو کمرے سوئمینگ پول،کلب بار سب ہی سمندر کے کنارے آباد ہیں آپ رہ کر گزار سکتے ہیں۔نیا بیروت کو شرم الشیخ کہہ سکتے ہیں۔

ترکی:

سب سے پہلے مجھے 1973ء میں حج کے بعد ترکی جانے کا موقع ملا۔اُس زمانے میں ترکی کی کرنسی لیرا ایک ڈالر میں صرف 14 لیرا ملتے تھے۔اب ایک ڈالر میں ڈیڑھ ملین سے دو ملین لیرا ملتے ہیں۔ترکی کے عوام پاکستانی عوام سے بہت متاثر ہیں اور اُن کی بہت عزت کرتے ہیں،میں چونکہ حج کر کے گیا

2004ء،بنکاک تھائی لینڈ کے شرکاء

تھا سو جو بھی مجھے ملتا تھا(چونکہ حج کی وجہ سے سر منڈوایا ہوا تھا) وہ میرا ہاتھ چومتا تھا 1973ء میں مہنگائی بھی اتنی نہیں تھی اور ترکی کے لئے ویزہ بھی نہیں ہوتا تھا تو جدہ سے سیدھا استنبول گیا۔ وہاں میرے ایک دوست سے شناسائی تھی اور ایک گلاس کمپنی سے ہم نے امپورٹ کے ذریعے دوستی بھی کر لی تھی۔ لہذا استنبول کو دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر 2004ء یعنی تقریباً تیس سال بعد دیکھنے کا موقع ملا، یہاں حضرت ایوب انصاری کا مزار اور دیگر مساجد بہت ہیں۔ جنہیں دیکھ کر اسلامی روایات تازہ ہوتی ہیں۔ اگرچہ ترک اب بہت ہی ماڈرن طرز زندگی گزارتے ہیں۔ اور یورپی یونین میں شمولیت کے لئے بے تاب ہیں نہ جانے کہاں تک یورپ کا مقابلہ کر سکیں گے۔ مگر ایک بات ترکوں میں خاص ہے جس کو وہ پسند کرتے ہیں اُن سے محبت کرتے ہیں اور جس سے نفرت کرتے ہیں اُن کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے پاکستان اُن کے لئے ایک برادر ملک سے کم نہیں ہے جسے وہ آخری حد تک پسند کرتے ہیں۔

کینیڈا:

امریکہ کے ساتھ ہی ملا ہوا ملک کینیڈا ہے یہاں لاکھوں پاکستانی رہتے ہیں۔ 1982ء تک تو ویزہ اس ملک میں ایئرپورٹ پر ہی مل جاتا تھا۔ میں کئی مرتبہ کینیڈا گیا اور ہمیشہ ایئرپورٹ پر ویزہ ہونے کی وجہ سے امریکہ سے ٹورنٹو شہر جاتا رہا ہوں۔ وہاں میرے قریبی رشتہ دار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ وہاں ایڈوانس ویزہ لینا ضروری ہو چکا تھا۔ مگر امریکہ کینیڈا سفر میں وہ ویزہ نہیں چیک کرتے لہذا میں کینیڈا کے شہر ٹورنٹو پہنچ گیا۔ ایئرپورٹ پر مجھے امیگریشن والوں نے پوچھا تمہارے پاس تو ویزہ نہیں ہے پھر تم کیسے کینیڈا میں داخل ہو سکتے ہو میں نے بہت بھول پن سے کہا میں پچھلے سال آیا تھا تو مجھے کسی نے نہیں روکا تھا تم میرے پاسپورٹ سے تصدیق کر سکتے ہو۔ اُس خاتون نے جس کی عمر 60 سال سے بھی زائد تھی۔ میری طرف دیکھا اور کہا واقعی تم پچھلے سال آئے تھے میں نے اپنا پاسپورٹ دکھایا

گردشِ ایام کی رونمائی کے شرکاء

اُس پر کینیڈا کی مہر لگی ہوئی تھی ۔اُس نے پوچھا تم کتنے دن رکو گے میں نے کہا 7دن (One Week) اُس نے مجھے صرف سات دن کا ویزہ جاری کر دیا اور کہا اگر کوئی مشکل حالات کا سامنا پڑے اور مزید رکنا پڑے تو ایک کاغذ مجھے پکڑا دیا اس دفتر میں چلے جانا وہ تمہارا ویزہ بڑھا دیں گے ۔مگر خبردار آئندہ ویزہ لے کر ہی ہمارے ملک آنا یہ تمہاری پہلی بھول تھی اس لئے میں نے خصوصی اختیارات کے تحت تمہیں ویزہ دیا ہے آئندہ دوسرا کوئی ویزہ نہیں دے گا میں نے کمپیوٹر میں لکھ دیا ہے۔خیر اُس کے بعد میں جب بھی کینیڈا گیا ہمیشہ ویزہ لے کر ہی گیا کنیڈین عوام امریکہ سے بہت مختلف لوگ ہیں بے حد ملنسار دکھ درد میں تو وہ ایسے شامل ہوتے ہیں جیسے وہ اور آپ ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں ۔اس ملک کی پالیسی بھی بہت ہی بہتر ہے وہ انسانیت کے علمبردار بھی ہیں ۔اُن کے ملک میں کوئی بھوکا نہیں مر سکتا نہ سو سکتا ہے اگر کسی کے پاس کام نہیں ہے اور کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے خواہ وہ غیر قانونی طور پر ہی کینیڈا میں رہتا ہے تو حکومت اُس کا بے روزگاری الاؤنس جاری کر دے گی ۔ملک بدر بھی نہیں کرے گی ۔یہی وجہ ہے 9/11 کے بعد غیر قانونی پاکستانی امریکہ میں رہتے تھے وہ امریکی پولیس کے خوف سے کینیڈا چلے گئے اور وہاں انہوں نے قانونی پناہ لے لی ۔اور شاباش کینیڈین حکومت کی کہ انہوں نے بلا امتیاز ہزاروں بھارتی ، پاکستانی ، بنگلہ دیشی لوگوں کو اپنے ملک نہ صرف آنے دیا بلکہ اُن کی مالی معاونت بھی کی ۔اسلامی نقطہ نظر سے کینیڈا فلاح و بہبودی کے کاموں میں ہمارے مسلمان ملکوں سے بہت آگے ہے۔وہاں انسانیت کی قدر ہوتی ہے۔مذہب دوسرے نمبر پر شمار ہوتا ہے اگر مجھے دنیا میں کسی دوسرے ملک میں رہنے کو کہا جائے تو میرا سب سے پسندیدہ ملک کینیڈا ہی ہوگا۔حالانکہ اس ملک میں صرف چار مرتبہ ہی جا سکا ہوں مگر اُن کا خلوص اور سادگی میں بھول نہیں سکتا۔

سومالی لینڈ کے صدر کے ساتھ فوٹو سلمان خلیل اعزازی کونسل جنرل سومالی لینڈ تاجر محمد عثمان نمایاں ہیں

یو۔اے۔ای:

یہ خلیجی ریاست ہے اس میں دبئ، ابوظہبی، شارجہ، راس الخیمہ، عجمان العین، فجیرہ، ام القیوین مل کر اس کو یونائیٹڈ عرب امارات کا نام دیا گیا ہے۔ ابوظہبی میں تیل پیدا ہوتا ہے بقایا ریاستوں میں کاروبار ہوتا ہے جس میں دبئ سرفہرست ہے۔ 1973ء میں میں لندن جاتے ہوئے (ہماری قومی ایئرلائن پی آئی اے) دبئ میں رُکا بہت چھوٹا ایئرپورٹ تھا یہاں صرف اُردو بولی جاتی تھی حتیٰ کہ ایئرپورٹ پر اُردو اور انگریزی میں اناؤنسمنٹ ہوتا تھا، گرمی اتنی شدید تھی کہ جہاز سے ایئرپورٹ تک آتے ہوئے پسینے چھوٹ گئے، اور غربت کا یہ عالم کہ ایئرپورٹ بھی ایئرکنڈیشن نہیں تھا جبکہ ہمارا کراچی ایئرپورٹ ایئرکنڈیشن ہوتا تھا۔ ایک گھنٹہ ٹھہرنا بہت ہی گراں گزرا جیسے ہی روانگی کا اعلان ہوا تو دوڑ کر غیر ایئرکنڈیشن بس میں سوار ہو گیا صحرا ہی صحرا تھا۔ معمولی مکانات جہاز سے میں نے دیکھے تھے۔ ہریالی تو نام کو نہیں تھی پھر آہستہ آہستہ اسی خطہ نے اتنی ترقی کی کہ آج ہم عش عش کر سکتے ہیں۔ یورپ کی تمام قومیں یہاں آباد ہو چکی ہیں۔ آپ کو رہائشی پرمٹ بھی مل سکتا ہے اگر آپ کوئی جائداد خرید لیں یا ٹیکس فری زون میں اپنی فیکٹری لگا لیں تو تین سال کا ویزہ تو فوراً مل جائے گا۔ اور آپ اس ویزہ کو بغیر کسی کفیل کے بڑھا سکتے ہیں دراصل یو۔اے۔ای میں کاروبار یا رہنے کے لئے کفیل کی ضرورت لازمی ہے یہ کفیل یواے ای کا باشندہ ہوتا ہے جو آپ کی، حکومت یواے ای کو ضمانت دیتا ہے کہ یہ میرا نمائندہ ہے اور میرے کاروبار کو سنبھالتا ہے حالانکہ تمام سرمایہ تو اس بے چارے غیر ملکی کا ہوتا ہے مگر قانونی طور پر آپ اس کے نام کے بغیر کاروبار نہیں کر سکتے اور آپ کا سرمایہ بھی اس عربی کے نام ہی تصور کیا جاتا ہے۔ مگر جب ان غیر ملکیوں نے ان کے نام سے فائدہ اٹھا کر قرضے لینے شروع کر دیئے اور بعد میں ادا بھی نہیں کئے تو یواے ای حکومت نے آہستہ آہستہ ان غیر ملکیوں کو بینک اور دوسری جگہوں پر خودمختار بنا دیا تا کہ اُن کے شہری اس دھوکہ دہی سے دُور رہیں۔ آج یواے ای کی تمام ریاستیں ڈائریکٹ ویزہ

کے این اکیڈمی کے دورے پر بوہری فرقے کے رہنما شہزادہ کلیم الدین خلیل نینی تال والا کو اجرک اور قرآنِ پاک پیش کر رہے ہیں

پالیسی اپنا چکی ہیں۔اُن کی کوشش یہی ہے کہ اب تاجر یا صنعت کار صرف دبئی میں اپنی فیکٹریاں نہ لگائیں بلکہ دیگر ریاستوں میں بھی لگائیں اور وہ بہت خصوصی مراعات بھی دینے کے لئے تیار ہیں یہی وجہ ہے کہ دبئی کے بعد شارجہ پھر عجمان راس الخیمہ فجیرہ میں صنعتی علاقے تاحال قائم ہو چکے ہیں۔ اور چونکہ دبئی بہت ہی مہنگا ہو چکا ہے اور دبئی کی ٹریفک اتنی گھمبیر ہو چکی ہے کہ لوگ اب شارجہ عجمان منتقل ہو رہے ہیں۔خصوصی طور پر کرائے تو دبئی میں آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ایسے میں تو دوسری ریاستوں میں جا کر تجارت یا صنعت سازی نہ صرف آسان ہے بلکہ سستی بھی ہے الغرض تجارت کے لحاظ سے دبئی ہی نہیں بلکہ پورا یواے ای اب تجارتی مرکز بن چکا ہے خواہ بھارت یا پاکستانی تاجر ہوں وہ اس ریاست کو چلا رہے ہیں۔اگرچہ اُن کی اکثریت بھی ہے مگر آئندہ چند سالوں میں یواے ای مغربی ممالک سے آنے والے صنعت کاروں، تاجروں اور ملازموں سے بھر جائے گا۔کیونکہ یورپ میں ٹیکس کا نظام بہت مہنگا ہے اور رہائش، خردونوش بھی بہت ہی مہنگی ہے اس کے برعکس یواے ای علاوہ گرم موسم کے ہر لحاظ سے سستا ہے محفوظ ہے۔اور اب جانا اتنا آسان ہے کہ بیس سال پہلے کا دبئی اب کوئی بھی نہیں پہچان سکے گا۔ہم پاکستانیوں نے اُس ملک کی آبیاری کی۔اُس کی ایئر لائنیں ایمریٹس بنا کر دی۔شہر تعمیر کئے آج وہ کہاں ہیں ہم کہاں ہیں کاش ہمارے حکمران اس سے سبق حاصل کر لیں تو ہماری یہی پاکستانی قوم جو یواے ای میں زندگی گزار رہی ہے وہ واپس پاکستان میں آ کر اُس کی ترقی میں حصہ دار بن سکتی ہے مگر ہمارے پاس افسوس قائداعظم اور قائد ملت کے بعد ایسا کوئی لیڈر رہی پیدا نہیں ہو سکا جو پاکستان کو اُس کے پاؤں پر کھڑا کر سکے اور جس نے ایسی کوشش بھی کی تو وہ تختہ دار پر چڑھ گیا۔اس کے بعد کون رسک لے گا۔کہ ایسا کام کرے کہ پاکستان بھی ترقی کی راہ پر چل سکے؟ ہم تو خود ایک دوسرے کے پاؤں کھینچنے میں مصروف ہیں۔بھلا ہم کیوں کسی کی ترقی پر خوش ہوں۔ایک بہت ہی پرانی یونانی کہاوت ہے کہ جب دشمن کی جیب میں آپ ہاتھ ڈال کر لوٹ سکتے ہیں تو پھر

2003ء دبئی کانفرنس کی روانگی کے موقع پر خرم خلیل محمد یوسف اکرم جنجوعہ

دوست کی جیب پر کیوں نظر رکھتے ہیں۔ کیا آپ کے دشمن ختم ہو چکے ہیں مگر افسوس مسلمان تو اپنے ہی دوست کی جیبوں پر نظر رکھتے ہیں اور اُن کی ہی جیبوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں ہمیں تو اپنے دشمن نظر ہی نہیں آتے جن کی جیبوں میں ہم سے بہت بڑھ کر مال جمع ہے۔ میں کس کس شہر یا ملک کی بات لکھوں جو ہم سے بہت پیچھے تھے مگر آج وہ سب ہم سے آگے جا چکے ہیں۔ ہم تو جہاں تھے وہاں سے بھی پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔ مثلاً ہمارے ملک میں جرائم سب سے کم تھے۔ قتل وغارت گری نہ ہونے کے برابر تھی۔ بہت ہی سادہ اور سستا ملک تھا۔ 1978ء تک تو ڈرگ کلاشنکوف (ہتھیار وغیرہ) تو کوئی جانتا بھی نہیں تھا ہم نے افغانستان کی جنگ میں اپنے آپ کو اتنا ملوث کر لیا کہ آج ہم دہشت گردوں کی لسٹ میں آ چکے ہیں کہاں ہم پستول کی گولی سے بھی آشنا نہیں تھے کہاں آج ہم کلاشنکوف چلانے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ افغانستان کے راستے ہمارے ملک میں نہ صرف جرائم بڑھے بلکہ اسلحہ منشیات غیر قانونی کاروبار عورت بچوں کی اسمگلنگ اتنی عام اور آسان ہوگئی کہ ہمارا پاسپورٹ پوری دنیا میں مشکوک ہو کر رہ گیا ہے ہم نے چالیس لاکھ افغانی اپنے ملک میں کیا آنے دیئے کہ خود پاکستانیوں کی شہریت مشکوک ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ پشاور میں رہنے والے پٹھان اور افغانستان سے ہجرت کرنے والے افغانی میں تو کوئی تمیز نہیں کر سکتا اور آج اِن افغانیوں نے 25 سال میں پاکستان کے ہر شہر میں تجارتی مراکز پر قبضہ کر رکھا ہے وہ ہر تجارت میں آ چکے ہیں اگر چہ اب افغانستان روسیوں سے آزاد ہو چکا ہے۔ مگر اب وہ پاکستان کو چھوڑنے کی سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہمارے سابق صدر ضیاء الحق نے کیا سوچ کر اُنہیں یہاں آنے دیا تھا کہ وہ ہماری معیشت پر ہی نہیں بلکہ ہمارے کلچر کو بھی تباہ و برباد کر چکے ہیں۔ آج ڈرگ اتنی آسانی سے پاکستان میں مل سکتی ہے جتنی ہمارے پڑوسی ممالک میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کابل سے چلا ہوا اسلحہ کراچی اس طرح پہنچ جاتا ہے جیسے اسلحہ نہیں بلکہ بچوں کا کھلونا ہو۔ ہمارے نوجوان اب تو اُس کو اس طرح استعمال کر رہے ہیں کہ خود کراچی جو سب سے محفوظ ترین شہر سمجھا

سلمان خلیل شیلڈ پیش کر رہے ہیں۔

کانفرنس 2003ء دبئی میں سلمان خلیل کو شیلڈ دے رہے ہیں

جاتا تھا آج سیکڑوں گاڑیاں، موبائل فون اور موٹر سائیکلوں کے چھیننے میں پورے ملک میں سب سے آگے جاچکا ہے۔ یہ اسٹریٹ کرائم کہاں تک جائیں گے کوئی نہیں جانتا۔ مگر خود حکومت کے اہلکاروں کے بغیر نہ یہ روکا جاسکتا ہے نہ ختم کیا جاسکتا ہے خصوصی طور پر جب ایک پولیس والے کی تنخواہ اتنی کم اور پاور اتنی زیادہ ہو کہ وہ وزیراعظم کے گھر میں داخل ہوسکتا ہے تو پھر تخریب کار تو اُن کو استعمال کریں گے ہی جو آج تک ہو رہا ہے۔ اللہ ہی جانے ہمارے حکمرانوں کی آنکھیں کب کھلیں گی وہ عوام سے کھیلنے کے بجائے پاکستان کو بچانے کی کوشش کریں ہمارے عوام تو اب عملی طور پر مردہ ہو چکے ہیں۔ اُن پر ایک دس کلو وزن ڈالیں یا سو کلو وزن ڈالیں وہ تو اُٹھانے اور ڈھونے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جب تک مشرقی پاکستان ہمارے ساتھ تھا تو حکمران ڈرتے تھے مگر جب سے یہ الگ ہوا ہے آج ہمارے حکمران مادر پدر آزاد ہو چکے ہیں اُس کی صاف وجہ ہمارے عوام کی بے حسی ہے جو ہر چیز کو برداشت کرنے کی عادات اپنا چکی ہے۔ بے حس قوم پر پھر ایسے حکمران آجائیں تو شکوہ کس سے کریں۔ کاش ہمارے درمیان اب کوئی قائداعظم پیدا ہوجائے تو شاید پاکستان بھی ترقی کر سکے فی الحال "ہر شاخ پہ الّو بیٹھا ہے انجامِ گلستاں کیا ہوگا"؟

میرے تاثرات:

تقریباً پوری دنیا گھومنے کے بعد میں اپنے تاثرات ضرور قلم بند کرنا چاہوں گا۔ ہر ملک میں مختلف لوگوں سے ملنے کے بعد اب یہ بہت مشکل ہے کہ کس کو میں بہتر لکھوں کیونکہ 1967ء سے جب سفر شروع ہوا تھا تو دنیا بالکل مختلف تھی آج 2006ء میں تو دنیا کا نقشہ ہی تبدیل ہو چکا ہے کہاں ہمارا پاسپورٹ پوری دنیا میں چلتا تھا اور آج ہم کو ویزہ بھی ملنا دشوار ہو چکا ہے میں نے 1970ء میں پہلا گلوبل ٹور World Tour کیا تھا جو کراچی سے ہانگ کانگ، جاپان، امریکہ، یورپ، مڈل ایسٹ کا ٹکٹ

2003ء دبئی کانفرنس میں خلیل احمد نینی تال والا بیگم حمیرہ پروین، سلمان خلیل ریاض الدین احمد انعامات دے رہیں ہیں

صرف 14000 ہانگ کانگ ڈالر جو دس ہزار پاکستانی روپوں کے برابر ہوتے تھے تین مرتبہ ایسا ٹکٹ خریدا اور دنیا گھوما آج اگر آپ کوئی ٹکٹ خریدیں تو اتنے روپے تو صرف ایئرپورٹ ٹیکسوں میں خرچ ہوجائیں گے ٹکٹ کم از کم ڈیڑھ سے دو لاکھ میں پڑے گا۔

وہ زمانہ تو اب خواب میں آسکے گا، کمیونسٹ اور سوشلسٹ ممالک کے عوام آج آزادی سے پوری دنیا گھوم سکتے ہیں جبکہ ہم جیسے آزاد ممالک کے عوام کے لئے ویزہ ناممکن نہیں بہت مشکل ضرور ہے۔ روس کے ٹوٹنے کے بعد اور 9/11 کی واردات کے بعد پوری دنیا کی سوچ اور جغرافیہ تبدیل ہو چکا ہے۔ خصوصاً ہم دیگر قوموں کے عوام اور مسلمان عملی طور پر ترازوں کے دو پلڑوں میں نظر آتے ہیں۔ کل تک مسلمان بہت ہی معصوم، بے ضرر، مہذب شہری نہ صرف مانے جاتے تھے بلکہ عملی طور پر قابل قدر ہوتے تھے۔ مگر آج یہی مسلمان دہشت گرد، غیر مہذب اور بہت ہی ضرر رسیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ باوجود اس مسلّمہ حقیقت 9/11 میں پاکستان کا ایک باشندہ بھی ملوث نہیں ہوا۔ افغانستان کی جنگ میں بھی کوئی ایک پاکستانی حتمی طور پر ملوث ثابت نہیں ہوسکا مگر پاکستان میں یورپی ممالک تجارتی افراد کو آنے کے لئے یورپین انشورنس دستیاب نہیں ہے گویا پاکستان دہشت گرد ملک ہے، اس سے زیادہ کرائم تو خود امریکہ کی ایک ایک ریاست میں ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہی مغربی ممالک کے تاجر نیویارک میں جانے سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔ مگر وہ ملک دہشت گرد نہیں سمجھا جاتا جہاں ہر سال 14 سے 16 ہزار قتل ہوتے ہیں ہزاروں ڈکیتیاں ہوتی ہیں اور لاکھوں خواتین کی عصمتیں دن دھاڑیں لوٹی جاتی ہیں۔ جبکہ ہمارے ملک پاکستان کے اعداد و شمار میں دو ڈھائی ہزار قتل پورے ملک میں ہوتے ہیں ڈکیتیاں اور خواتین کی عصمتوں کے لوٹنے کا تناسب امریکہ کے مقابلے میں دس فیصد بھی نہیں ہے مگر ہم پھر بھی اتنے بدنام ہیں۔ بھارت کے پروپیگنڈہ پر جہاں ہم سے بڑھ کر غربت اور کرائم موجود ہیں۔ اُس کو جمہوریت کے نام پر بخش دیا جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے ملک میں فوجی حکومتیں آتی رہی ہیں اس لئے ہم کو

2003ء دوئی کانفرنس کے شرکاء

پوری دنیا کے سامنے غیر جمہوری ملک کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے باوجود اس حقیقت کہ خواہ جمہوری ممالک ہوں بھارت یا یورپ امریکہ کی حکومتیں کیوں نہ ہوں انہوں نے ہمارے فوجی حکمرانوں سے خود غیر جمہوری مراعات حاصل کیں ۔ ہمارے ملک سے اپنے دشمنوں پر حملے کئے، ہمیں بتائے بغیر اور بغیر قانونی تقاضے پورے کئے اپنے دشمنوں کو راتوں رات اپنے جہازوں سے لیکر اپنے ملک چلے گئے اور مقدمات چلا کر انہیں سزائے موت بھی دے دی۔ کسی بھی ہیومن رائٹ تنظیموں نے اس پر نہ احتجاج کیا اور نہ ہی اُس سزائے موت کے خلاف جلوس نکالے گئے ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہمارے فوجی حکمران تھے ۔ اُن کے ادوار اُن کو پسند ہیں مگر بظاہر وہ اُس دور کے فوجی حکمرانوں کو خود نوازتے رہے ہیں ۔ اور جمہوریت کے لئے ڈراتے بھی رہے ہیں تاکہ اُن پر اُن کی سرپرستی کا لیبل نہ لگے ۔ حقیقت تو یہی ہے کہ وہ ایسے ہی حکمرانوں کو پوری دنیا میں نہ صرف پسند کرتے رہے بلکہ اُن کو تحفظ بھی فراہم کرتے رہے ہیں ۔ خواہ وہ بادشاہی نظام ہو فوجی حکمرانی ہو وہ اُن کے لئے بہتر ثابت ہوتی ہے ۔ صدام حسین کو آخر کس نے 1990ء کی عراق ایران جنگ کے لئے تیار کیا ۔ اُسامہ بن لادن کو کس نے افغانستان کی جنگ کے لئے بھیجا تاکہ روس افغانستان میں قدم نہ جما سکے ۔ شاہ ایران کس کا ایجنٹ تھا جو ایشیا اور مڈل ایسٹ کا پولیس مین مانا جاتا تھا پانامہ کا صدر کس کے اشاروں پر چلتا تھا مارکوس کس کا نمائندہ تھا لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک آپ بڑوں کی ہاں میں ہاں ملائیں گے تو آپ ہی اُن کے نمائندے ہیں اور جس دن آپ نے آنکھ دکھائی تو پھر آپ کا انجام شاید خود آپ کو بھی نہیں معلوم کہ کیا ہوگا ۔ لہذا ہمارے عوام ہمیشہ حکمرانوں کے سامنے خاموش رہتے ہیں سڑکوں پر آنا اب آؤٹ آف فیشن ہو چکا ہے ۔ مہنگائی بھی اتنی بڑھ چکی ہے کہ روزمرہ کے اخراجات کے سامنے Daily Wages کے ملازمین اور ٹھیلے لگانے والے افراد حکومت کے سامنے مظاہرہ کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے البتہ وہ دل سے تو بُرا مانتے ہیں آپس میں حکومت کے خلاف بولتے ہیں ۔ مگر اس سے آگے گزرنے کی ہمت

2004ء بنکاک تھائی لینڈ کی کانفرنس کے موقع پر

2004ء بنکاک تھائی لینڈ کی کانفرنس کے موقع پر تقسیم انعامات

نہیں کرتے وہ ویسے بھی سیاست دانوں کی ہڑتال کی اپیل سے خوش نہیں ہوتے مگر دوکاندار اپنی دوکانیں، صنعت کار اپنی فیکٹریاں، تاجر اپنے دفاتر صرف اور صرف اس لئے بند کرنے پر مجبور ہیں کہ اُن کی دکانیں، فیکٹریاں اور دفاتر کھولنے کی صورت میں اگر ہجوم نے شیشے توڑنے کی یا فیکٹری کو آگ لگانے کی کوشش کی تو حکومت کی طرف سے کوئی سیکورٹی فراہم کی نہیں جاتی ہے اور بصورت دیگر اُن کی دوکانیں، دفتر یا فیکٹریاں غیر محفوظ ہو کر رہ جائے گی بھلا اتنا بڑا رسک کون لے گا۔ سیاست دانوں پر الزام ہے کہ وہ کرپٹ ہوتے ہیں جمہوریت کے نام پر اپنی لیڈری چمکاتے ہیں مجھے اس سے اختلاف ہرگز نہیں ہے مگر اس ملک میں اگر جمہوریت کو پنپنے دیا جاتا تو آج یہ بگڑ کر سنبھل گئی ہوتی مگر افسوس ہر دس بارہ سال بعد ہمارے فوجی حکمرانوں نے ان کرپٹ سیاست دانوں کے نام پر فوجی انقلاب برپا کیے۔ اگر حقیقی موازنہ کیا جائے تو ہمارے تمام فوجی حکمران اس میں ملوث ہی نظر آتے ہیں خواہ وہ ایوب خان کا دور ہو یا یحیٰی خان کا دور ہو ان دونوں حکمرانوں نے فوج اور سیاست دانوں کو استعمال کیا اور انہی کے سہارے اپنے اقتدار کو مضبوط کیا۔ صدر ایوب خان نے اقتدار اپنے آخری دور میں سیاست دانوں کو حوالے کرنے کے بجائے اپنے ہی عیاش جنرل کے حوالے کر دیا اگر وہ چاہتے تو اپنی اس غیر قانونی اور سیاسی اقتدار کے قبضہ کو جو انہوں نے غیر جمہوری طریقہ سے حاصل کیا تھا سیاست دانوں کے حوالے کر کے اس غلطی کا ازالہ کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا جس کی وجہ سے اُس زمانے میں مشرقی پاکستانی لیڈر شیخ مجیب الرحمان نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اُن پر اگرتلہ سازش کا مقدمہ تھا خود مجیب الرحمان بھی معمولی سیاسی کردار رکھتے تھے مگر اُن کی طویل اسیری نے اُن کو بہت ہی بڑا سیاسی لیڈر کے طور پر ابھار دیا جس کی آڑ میں انہوں نے مشرقی پاکستان کے بنگالی عوام کے سامنے ایسا ڈراما رچایا کہ وہ سقوط ڈھاکہ پر ختم ہوا اور ہمارا پیارا ملک پاکستان ایک ہی رات میں دولخت ہو گیا۔ اس کا جتنا ماتم اور افسوس کیا جائے وہ کم ہے۔ خود مشرقی پاکستان کے بنگالی صرف سیاسی مساوات اور حکومت میں اپنا حصہ

خرم خلیل اور سلمان خلیل کے ہمراہ فوٹو۔

2004ء بنکاک تھائی لینڈ کانفرنس کے شرکاء کو انعامات دے رہیں

چاہتے تھے وہ ہرگز ملک توڑنے کے خواہش مند نہیں تھے۔مگر ہمارے مغربی پاکستان کے خودغرض سیاست دان دراصل مشرقی پاکستان سے جان چھڑانا چاہتے تھےاور یحیٰی خان نے انہی سیاست دانوں کے کندھے پر بندوق رکھ کر اپنا یہ کام کر دکھایا جس کے نتیجے میں آج پاکستان آدھا ہوکر بنگلہ دیش کی صورت اختیار کر چکا ہے۔مسلمان ملکوں کے حکمران اب ایک ہونے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔جبکہ دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں اور اس تقسیم کو سیاست دانوں کی کارکردگی قرار دیتے ہیں۔اس کا زندہ ثبوت یہ کہ اگر پاکستان کرکٹ اور ہاکی میں ہندوستان سے کھیلتا ہے تو بنگلہ دیشی عوام ہمیشہ پاکستانی ٹیم کو سپورٹ کرتے ہیں اور ہندوستانی ٹیم کو غیر ملکی ٹیم سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ بھارت نے بنگلہ دیش بننے کے بعد 1971ء میں بنگلہ دیش کی تمام صنعتیں اور تمام مشینریاں نکال کر بھارت منتقل کر دیں تھی۔اس طرح بنگلہ دیش صنعتی طور پر دس سال تک اپنی بقاء کی جنگ لڑتا رہا،غربت اور معاشی بدحالی کے علاوہ بنگلہ دیش میں ہر سال کی سیلابی تباہی اُس کو پنپنے نہیں دے رہی تھی پھر بھی بنگلہ دیشی تاجر صنعتکاروں نے بھارت کے مقابلے میں اپنی ساکھ بنائی گو وہ آج بھی اس جنگ میں مصروف ہیں مگر یہ جنگ جس کو معاشی جنگ کہتے ہیں وہ اتنی آسان نہیں ہے۔بھارت بنگلہ دیش کے مقابلے میں بہت بڑا ملک ہے پھر وہ مسلمان ملک سے بغض بھی رکھتا ہے۔

مسلمان ممالک کا کردار:

بدقسمتی تو دیکھئے کہ 1970ء تک خلیجی ممالک کا کوئی سیاسی اور معاشی کردار نہیں تھا تیل ان ممالک میں نکل چکا تھا اُس کے دوررس فوائد بھی نظر نہیں آرہے تھے،پاکستان کی لیبر(مزدور) ان خلیجی ریاستوں میں جن میں خصوصی طور پر سعودی عرب اور امارات (دبئی،ابوظہبی،شارجہ) میں اس ریگستان کو جدید شہر بنانے میں بہت اہم کردار ادا کر رہے تھے وہ دن رات تپتی ہوئی ریت میں لگے ہوتے تھے تو

2004ء بنگلہ تھائی لینڈ کے شرکاء

دوسری طرف ہمارے بنکار، صنعتکار، ٹرانسپوٹرز حضرات بھی ان نومولود ریاستوں کو اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے آگے بڑھانے کے لئے سرتوڑ کوشش میں لگے ہوئے تھے اسی لئے یہ ریاستیں بہت جلد ترقی کی سیڑھی پر قدم جما گئیں۔ اور ہمارا ملک بہت پیچھے رہ گیا۔ اندازہ لگائیں کہ ہم نے بینکنگ میں ائرلائین میں ان خلیجی ممالک کی ٹیموں کو ٹریننگ دی۔ ایمریٹس ایئرلائنیں اور سعودی ایئرلائنوں کو ہم نے بنا کر دی۔ ہمارے تعلیمی اداروں نے ان کے طالب علموں کو پڑھایا ہماری فوج نے ان کے فوجی تیار کئے الغرض ہر شعبہ میں ہم ان سے بہت آگے تھے مگر ان خلیجی ریاستوں میں تیل نکل آنے کے بعد وہ دولت اور تیل کے سہارے اتنے آگے بڑھ گئے کہ ہم رشک سے اُن کو دیکھتے ہیں۔ مگر جب 1967ء کے بعد ان خلیجی ریاستوں میں تیل نکلا تو انہوں نے آنے جانے کے لئے پاسپورٹ اور ویزے کی پابندیاں لگا دیں۔ غریب مسلمان ممالک کی امداد کرنے کے بجائے انہیں حقیر سمجھا۔ آج یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمان یورپی ممالک کے برعکس الگ الگ ہیں۔ اگر ہم ایک ہو جائیں تو دنیا ہماری بات ماننے پر مجبور ہوگی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ ہم غیر مسلموں کے آلہ کار ہیں۔ ایک دوسرے کی سرحدوں کو توڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ صحیح معنوں میں ہم مسلم ملکوں نے تیل سب سے زیادہ پیدا کرنے کے باوجود اُس سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ آج بھی ہم کوئی قابل رشک پلاننگ نہیں کر رہے ہیں۔ عراق ایران جنگ، پھر عراق کویت جنگیں ہم نے لڑیں اس سے صرف مسلمانوں کا ہی خون رائیگاں گیا۔ ذلت و رسوائی الگ ہوئی۔

کالم نگاری:

جب سیاست اس ملک سے عملی طور پر ختم ہوگئی، صرف روپے پیسے کرپشن اور اسلحہ کے زور پر ووٹ ڈالنے کا رواج عام پانے لگا تو میں نے 1996ء میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور کاروبار پر

خلیل احمد نینی تال والا وڈورڈ کے سید سعید شاہ کو شیلڈ دے رہے ہیں۔

کوالالمپور کانفرنس 2005ء کے موقع پر

توجہ کے ساتھ ساتھ 1997ء سے جنگ اخبار میں کالم لکھنے لگا۔تقریباً ہر اتوار سنڈے اسپیشل میں میرے مضامین چھپنے لگے۔جن موضوعات پر قلم اٹھایا اُن میں سیاست،ثقافت،کھیل،عالمی دنیا کے عملی تجربات اور دوروں کی روداد،حکومت اور حزب اختلاف کے غلط رویوں پر تبصرے ھلکے پھلکے چٹکلوں سے اپنے مطلب کی بات لکھ کر قارئین کی نظر کر دیتا تھا جو آج بھی جاری ہے۔اُس سے دل کو تسکین ہو جاتی ہے۔اور عوام کو اُن کی ترجمانی کرنے کا حق ادا ہو جاتا ہے۔اب تک چار تصانیف شگوفہء نو،گردش ایام ،حالات و واقعات اور کاش میں سیاست میں نہ آتا،مارکیٹ میں کتابوں کی شکل میں آچکی ہیں۔ان چاروں کتابوں کی آمدنی یتیم بے سہارا معذور بچوں کا ادارہ دارلسکون جو کشمیر روڈ پر واقع ہے اُن کو بھجوا دیتا ہوں۔ان چاروں کتابوں کو ہمدرد پریس کے مالک سلیم مرزا صاحب نے مفت چھاپ کر دیں۔اور اس ثواب میں برابر کے شریک رہے۔انشاءاللہ اس کتاب کی آمدنی بھی دارلسکون کو دی جائے گی۔افسوس تو اس بات پر ہے کہ اب لکھنے پڑھنے اور کتب بینی میں بہت کمی آچکی ہے۔خصوصاً نئی نسل تو کمپیوٹر اور نیٹ سے فائدہ اُٹھا رہی ہے لائبریریاں غیر آباد ہوتی جا رہی ہیں۔جو پڑھی لکھی قوم بننے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

میں نے کالم نگاری کے ساتھ ساتھ فلاحی کاموں پر بھی توجہ دی۔خصوصاً ہماری برادری کے ادارے جمعیت پنجابی سوداگراں دھلی سے گزشتہ 7 سال سے وابستگی رہی 5 سال سے اس کا اعزازی صدر بھی ہوں۔اس ادارے کے ماتحت چلنے والے اسپتال اور اسکولوں کا چیئرمین بھی رہا۔کافی اصلاحات اپنے مجلس عاملہ کے افراد کے ساتھ مل کر نافذ کیں۔صرف اور صرف اللہ سے اجر کی خاطر آج بھی اس سے وابستہ ہوں۔

تعلیمی میدان میں اپنے ذاتی وسائل سے کے این اکیڈمی کی 1999ء میں بنیاد رکھی۔اور صرف 15 ماہ میں ایک عظیم الشان اسکول معہ ہاسٹل تعمیر کیا۔جو 25 ایکڑ کے رقبہ پر ہے۔یہ پاکستان کی سب سے

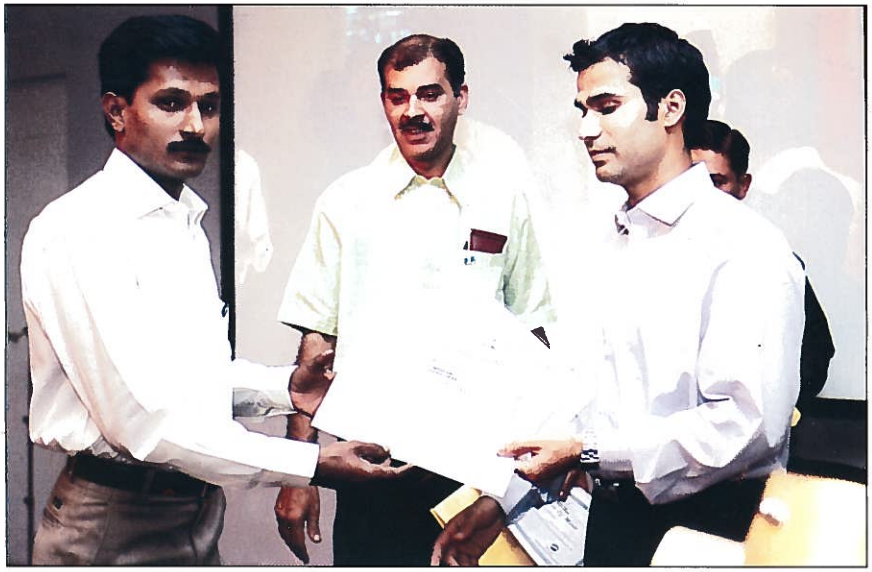

2006ء فوکٹ کانفرنس کے موقع پر تقسیم انعامات

خوبصورت درسگاہ کا درجہ حاصل کر چکا ہے ۔اس میں لائبریری ،ہاسٹل ،مسجد،آڈیٹوریم ،سیوئمنگ پول،اسکیٹنگ رینک ،جمنازیم ،باسکٹ اور والی بال ،ٹیبل ٹینس ،بیڈمنٹن ،کرکٹ،فٹ بال،ہاکی، چڑیا گھر،تعلیمی معیار اے اینڈ او لیول ہے۔بغیر کسی نفع نقصان کے اس ادارے کو چلایا جارہا ہے۔اس میں کسی بھی قسم کا چندہ یا گرانٹ نہیں لی جاتی ہے۔غریب بچوں کو کتابیں، یونیفارم،اور تعلیم مفت اسکالرشپ کی شکل میں دی جاتی ہے۔دو سال سے جمعیت تعلیم القران سے بھی منسلک ہوں ۔جہاں مدرسوں میں مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ہزاروں مدرسوں کی سرپرستی میں یہ ادارہ بہت فعال ہے ۔جیل میں بیرکوں کے علاوہ قیدیوں میں کھانا، دوائیں تقسیم کی جاتی ہیں۔خصوصی طور پر بچے کچے کھانے جمع کر کے غریب آبادیوں میں بانٹا جاتا ہے۔ہسپتالوں میں بھی مفت ادویات فراہم کی جاتی ہیں۔

دیگر تجارتی خدمات میں ایک سال پاکستان فارماسیوٹیکل مینوفیکچرنگ ایسوسی ایشن کا مرکزی صدر اور ایک سال سندھ بلوچستان کا چیئرمین بھی رہا گزشتہ 20 سال سے پاکستان سوات کا سمیٹکس مینوفیکچرز گروپ کا چیئرمین ہوں۔

کھیلوں کی سرپرستی کرتا ہوں جس میں کرکٹ،فٹ بال سرفہرست ہے۔گذشتہ پانچ سال سے کراچی سٹی کرکٹ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام انڈر 15،انڈر 17،انڈر 19 کرکٹ ٹیلنٹ ہنٹ پروگرام اسپانسر کرتا ہوں۔اس میں ہمارے تینوں ادارے میڈی کیم، ٹچ می اور ووڈورڈ پاکستان لمیٹیڈ حصہ لیتے ہیں۔گذشتہ 7 سال سے کراچی سٹی کرکٹ ایسوسی ایشن کا نائب صدر ہوں۔جبکہ دو سال سندھ ہاکی فیڈریشن کا بھی صدر رہا ہوں۔ہمارے اداروں نے کرکٹ ،ہاکی ،فٹ بال،شوٹنگ بال ،کک باکسنگ، ہیوی ویٹ چمپئن شپ،اسکیٹنگ کے میچ اسپانسر کئے ہیں تاکہ کھیلوں سے عوام محظوظ ہوسکیں۔ اور ہمارے بچے تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کھیل کے میدانوں میں بھی مشغول رہیں۔ان سماجی کاموں سے بھی دل کو بڑی راحت ملتی ہے۔اور نئے نئے کھلاڑیوں منتظمین اور دوستوں سے ملاقات

2005ء کی سالانہ کانفرنس کے شرکاء کے ساتھ

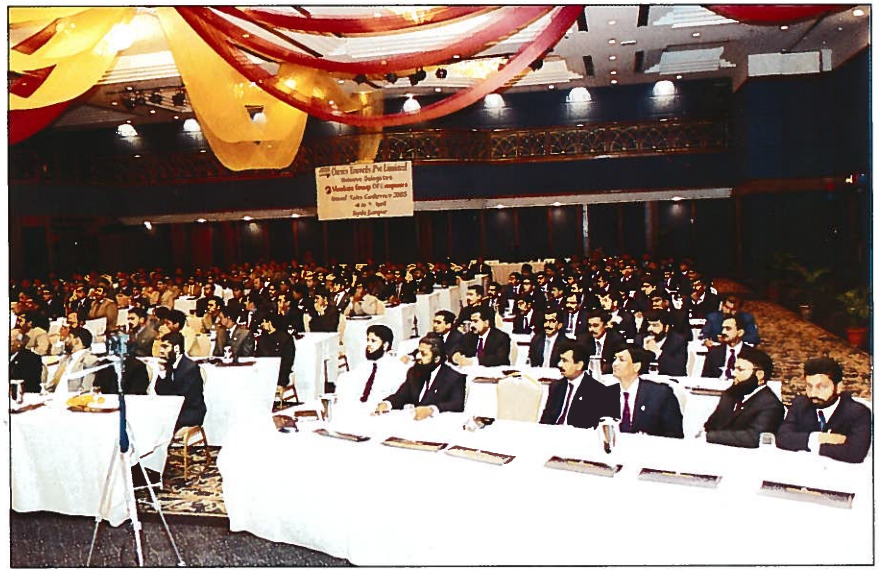

2005ء کی سالانہ کانفرنس کوالالمپور میں شرکاء

رہتی ہے۔جن میں خصوصی طور پر اُردو کمنٹری کے بانی جناب منیر حسین، سراج السلام بخاری، ڈاکٹر ایم اے شاہ، ہینو پاک کے شیخ عرفان، ڈاکٹر سرجن فیض محمد شامل ہیں جو کھیلوں کی سرپرستی میں آگے آگے رہتے ہیں۔

40 سال سے پوری دنیا میں تجارتی دورے کر رہا ہوں۔تقریباً 10 پاسپورٹ بھر چکے ہیں۔خدا کے فضل سے لاتعداد حج اور عمرہ کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔گزشتہ چار سال سے اپنے اسٹاف کے ساتھ جن کی تعداد اب 350 سے تجاوز کر چکی ہے ہر سال غیر ممالک میں سیلز کانفرنس کا انعقاد کرتا ہوں۔جس کو بڑی خوش اسلوبی سے میرے بڑے صاحبزادے سلمان خلیل مارکیٹنگ ڈائریکٹر ہر سال بڑے زور و شور سے منعقد کرتے ہیں۔ان کی معاونت میں خرم خلیل اور جنید خلیل پیش پیش ہوتے ہیں۔چار مرتبہ پوری دنیا کا گلوبل دورہ بھی کر چکا ہوں۔خلیج اور ایشیاء کے 80 فیصد ممالک دیکھ چکا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے ہمت حوصلہ، شہرت، دولت، صحت سب چیزوں سے نوازا۔فیملی بھی اچھی ہے کسی قسم کی آپس میں تلخی نہیں پائی جاتی سب ہی میرے ساتھ مل کر رہ رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس اتحاد کو برقرار رکھے۔آمین۔الحمدااللہ کسی سے نا ہی جیلس ہوتا ہوں نہ ناامیدی کی چادر اوڑھتا ہوں۔ناکامی سے نہیں ڈرتا صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتا ہوں۔زندگی میں بہت نشیب و فراز آئے۔اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کر لئے۔سیاسی شخصیتوں سے بھی بہت ملاقات رہی۔جن میں پروفیسر غفور احمد، نصراللہ خان مرحوم، غوث بخش بزنجو، محترمہ بے نظیر بھٹو، مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم، اصغر خان، غلام مصطفیٰ جتوئی نفیس صدیقی، عبدالستار افغانی مرحوم شامل ہیں۔کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں تو پائلٹ بننا چاہتا تھا۔تاجر کیسے بن گیا پھر صنعت کاری نہ جانتے ہوئے بھی اللہ نے اتنا نوازا جس کا میں جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔اگر پائلٹ بن جاتا تو آج گم نام ہی ہوتا مگر قدرت نے مجھے عوام میں مقبول بنانے کے لئے صنعت کاری کی طرف راغب کیا جو آج تک جاری ہے۔صنعت کاری میں تین اصول کبھی ہاتھ سے

2006ء کانفرنس نوکٹ۔بنکاک

نہیں جانے دیئے۔سب سے پہلے معیاری اجزاء جن میں پرفیوم، پیکنگ پر بھرپور توجہ اور درمیانی قیمت تاکہ ہر ایک شخص آسانی سے خرید سکے۔عوام کی جیب پر زیادہ بار نہیں پڑنا چاہئے۔کوالٹی میں کمپرومائیز نہیں کرتا ملتے جلتے نام یا پیکنگ سے پرہیز کرتا ہوں۔اپنی انفرادی پیکنگ پر توجہ دیتا ہوں۔بینک سے قرض لینے سے ہمیشہ دور رہتا ہوں۔اپنی چادر دیکھ کر پیر پھیلاتا ہوں۔آج تک الحمدللہ کسی کا پیسہ نہیں کھایا۔نہ کسی کے پیسے کی طرف دیکھنا پسند ہے۔نام ونمود کے لئے نیکی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔جب بھی کوئی کامیابی ہوتی ہے اللہ کا شکر خصوصی طور پر ادا کرتا ہوں۔اور خیرات خاموشی سے کرنا پسند کرتا ہوں۔جھوٹ سے نفرت کرتا ہوں اور جھوٹے لوگوں سے دور رہتا ہوں۔وقت کی پابندی کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دوسرے بھی وقت کی پابندی کریں۔جو سچی بات ہوتی ہے برملا کہہ دیتا ہوں۔مکروفریب کی سیاست سے نفرت کرتا ہوں۔اسی طرح کاروبار میں صاف ستھرا کاروبار کرنا پسند کرتا ہوں۔یہی اصول میرے کاروباری ترقی کی وجہ ہے۔جب وعدہ کرتا ہوں حتی الامکان پورا کرتا ہوں۔ورنہ وعدہ ہی نہیں کرتا۔جھوٹے وعدوں سے نفرت کرتا ہوں۔اچھے لوگوں سے میل ملاپ رکھتا ہوں۔اور غلط لوگوں اور غلط قسم کے کاروبار کرنے والوں سے بہت دور رہتا ہوں کسی کا حق دبانے میں الحمدللہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا ہوں بلکہ اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔کسی کی تاک جھانک سے دور رہتا ہوں۔اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی معاف کر دیتا ہوں۔

آخری باب

میری غلطیاں:

دنیا میں ایسا کوئی انسان نہیں جس نے غلطیاں نہیں کیں ہوں، بالکل اسی طرح میں نے بھی غلطیاں کیں مثلاً 1969ء میں مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہو رہے تھے۔اُس وقت چٹاگانگ میں مقامی

وقاص عبداللہ ایوارڈ دے رہے ہیں۔

2006ء کانفرنس فوکٹ۔بنکاک میں

دوائی کمپنی خریدنا اور دفتر قائم کرنا کاروباری لحاظ سے ایک اچھا فیصلہ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر 5 سال ہمیں اور مل جاتے تو ہم اس کو بہت نفع بخش بنالیں گے مگر بدقسمتی سے صرف 2 ہی سال میں مشرقی پاکستان الگ ہوکر بنگلہ دیش بن گیا۔ بہت سا مال چٹاگانگ میں تھا وہ میرے بھائی محمد الیاس نینی تال والا کراچی نہیں بھجوا سکے اور رمضان المبارک کی وجہ سے ادھورا چھوڑ کر کراچی آ گئے۔ رمضان کے بعد بھارت نے مشرقی محاذ پر جنگ چھیڑ دی، پھر واپس جانا نہیں ہوا، لاکھوں روپے کا مال چٹاگانگ میں رہ گیا اور بہت سارا درآمدی مال جو بعد میں پہنچا وہ بنگلہ دیش کی حکومت نے قبضہ میں لے لیا۔ کاروبار میں اکثر میں بہت رسک لے لیتا تھا۔ میرا معقولہ یہ تھا NO RISK NO GAIN مگر میرے پارٹنر محمد الیاس اس معاملہ میں مجھ سے مختلف خیالات رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر اُن سے اختلاف رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ میں فیصلہ بہت جلد کرنے کا عادی تھا۔ اگر کسی کام کو کرنے کی ٹھان لی تو بس اب کرنا ہی ہے۔ خواہ کتنا فائدہ ہو یا کتنا نقصان ہی کیوں نہ ہو اس کی پرواہ نہیں کی۔ بہت سے دوستوں پر کاروباری اعتبار بھی کیا کیوں کہ جلد بازی میں کیا گیا ہوتا تھا تو کبھی نقصان بھی اُٹھانا پڑا، دوست پیسے کھا گئے۔ ایک بہت بڑا رسک 1971ء میں دوسری کمپنیوں کی یک لخت ایجنسیاں چھوڑنا بھی بہت نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔ مگر دو کشتیوں میں سوار ہوکر اپنی کمپنی کی ادویات کیسے بناتا اور کیسے بیچتا۔ خیر اللہ نے بہت کرم فرمایا اور بہت آسانی سے کشتی پار لگادی، بہت مشکلات کے وقت دیکھے۔ 1971ء میں ڈھاکہ فال ہوا، آدھا سرمایہ وہیں رہ گیا۔ 1973ء میں جینرک ایکٹ آیا اللہ نے 1971ء کا بدلہ دے دیا۔ پاکستانی کمپنیوں کا کاروبار بڑھ گیا اور غیر ملکی کمپنیاں بند ہوگئیں۔ پھر 1976ء میں فیکٹری میں آگ لگ گئی۔ 1976ء میں ڈرگ ایکٹ پھر تبدیل ہوگیا۔ غیر ملکی کمپنیاں پھر سے میدان میں آگئیں اور پاکستانی کمپنیاں بند ہوگئیں۔ خود میری کمپنی چاس۔اے۔مینڈوز ابھی بند ہوگئی جس کی وجہ سے کافی نقصان ہوا۔

2006ء کانفرنس منعقدہ فوکٹ۔ بنکاک انعامات تقسیم کرتے ہوئے

سلمان خلیل آصف شملہ والے کو ایوارڈ دے رہے ہیں زاہد حسین بھٹی نمایاں ہیں۔

1977ء میں بھٹو صاحب کی حکومت ختم ہوگئی۔ فوجی حکومت آگئی، لائسنس بحال ہوگیا۔ 1978ء میں کاسمیٹکس کا تجربہ کیا پہلی جاپانی کمپنی کا مال بنایا "سبولی فرام جاپان" مگر کامیابی نہیں ہوئی جلدی جلدی میں بہت ساری اشیاء بناڈالیں کچھ خراب ہوگئیں کچھ کو لوگوں نے پسند نہیں کیا۔ مگر ہمت نہیں ہاری پھر TOUCHME کے نام سے 1979ء میں پھر کاسمیٹک بنائی صرف ایک ٹالکم پاؤڈر سے کام شروع کیا۔ دو سال بعد ایک اور آئٹم شیونگ کریم شروع کی پھر اللہ نے اس کو بھی نفع بخش بنادیا۔ غلطیوں سے سبق سیکھ کر دوبارہ تجربہ نہیں کیا۔ البتہ چھ مرتبہ شیمپو بنایا نہیں چلا مگر ساتویں مرتبہ MEDICAM کے نام سے 1997ء میں شیمپو بنایا وہ الحمدللہ بہت چلا۔ بار بار غیر ممالک کے دورے کئے بہت کوششیں کیں کہ کوئی غیر ملکی کمپنی کے ساتھ مل کر کام کروں مگر ہمیشہ ناکامی ہوتی رہی۔ 1993ء میں یہ فیصلہ کیا کہ اب صرف اپنے ہی نام سے کاروبار کروں گا۔ اللہ نے کامیابی دی اور غیر ملکی کمپنیوں سے آج بڑھ کر کام اور نام دونوں ہی دے دیئے۔ ایک جلد بازی کے ساتھ غصہ بھی بہت جلد آجاتا تھا۔ جھوٹ، مکروفریب، دھوکہ برداشت نہیں ہوتا تھا۔ مُنہ پر ہی دوسروں کو کھری کھری سُنا دیتا تھا۔ جس کی وجہ سے نقصان بھی ہوجاتا تھا۔ مصلحت پسندی یا یوں کہئے نمائشی باتیں پسند نہیں تھیں۔ غلط باتیں ہضم نہیں ہوتی تھیں۔ وعدہ خلافی پر تو بہت چراغ پا ہوجانا معمول کی بات تھی۔ بہت سے لوگ مجھے مغرور بھی سمجھتے تھے ، دراصل جو مجھے ایک مرتبہ پرکھنے میں پسند نہیں آتے تھے میں دوبارہ اُن کی طرف نہیں جاتا تھا۔ بلکہ اُن سے بہت دُور رہتا تھا اسی وجہ سے وہ مجھے مغرور کہتے تھے۔ سیاست میں جانا بھی میری غلطی تھی اُس سے نام تو بیشک ملا مگر کاروبار ڈھیلا ہوگیا۔ دوطرف دھیان دینا خصوصاً جب سیاست میں پیسہ بنانا معیوب سمجھا جائے تو پھر جیب ہی سے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جو یقیناً نقصان کا سبب بنتا ہے یعنی وقت بھی دیں پیسہ بھی خرچ کریں حاصل بھی کچھ نہ ہو۔ بہرحال آج تک کوئی سیاسی فائدہ نہ اُٹھا کر پچھتاوا نہیں ہے، ہاتھ صاف ہیں کوئی بدنامی حصے میں نہیں آئی ورنہ بڑے بڑے مواقع ہاتھ آئے کروڑوں نہیں اربوں کی

سالانہ کانفرنس 2006ء فوکٹ۔ بنکاک میں شریک شرکاء کے ساتھ

لوٹ مار میں حصہ داری کی آفر کی گئی الحمداللہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔اگر ایسا کیا ہوتا تو یقیناً اُس کا اثر اولاد پر بھی پڑتا یہی وجہ ہے میری اولاد بھی میری طرح کھری ہے۔لگی لپٹی باتوں پر وہ یقین نہیں رکھتی۔ البتہ اتنی غلطیوں کے باوجود اللہ نے ہمیشہ حوصلہ بڑھا کر رکھا، مایوسی نزدیک نہیں بھٹکنے دی۔کوئی غلطی دوبارہ نہیں دُھرائی غلطیوں سے سبق حاصل کیا۔خوش آمدی دوستوں سے دور رہتا ہوں مگر پھر بھی انسان ہوں خوش آمدی مجھے پھر گھیر لیتے ہیں کیونکہ جلدی اعتبار کر لیتا ہوں۔فیملی مجھے سمجھاتی ہے کہ دوسروں کی غلطیوں کی نشاندہی نہ کرو مگر مجھ سے جھوٹ نہیں چھپایا جاتا اب کوشش کرتا ہوں کہ کم سے کم الجھوں مگر پھر بھی الجھ جاتا ہوں۔میں اپنے آپ کو کوئی پارسا نہیں بتا رہا ہوں۔بے عیب ذات صرف اللہ کی ہے ہم سب دنیا کے لالچ میں گھرے ہوئے ہیں۔اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہماری رہنمائی کر کے سیدھا راستہ دکھاتا رہے ورنہ بھٹکنے میں دیر نہیں لگتی۔ساری داستان اپنے ضمیر کے مطابق کھول کر آپ کے سامنے لکھ دی ہے۔خدا نے اپنا کرم اتنا فرمایا ہے کہ جسے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔صرف اس واقعہ سے اندازہ لگائیں کہ 1978ء سب سے کھٹن سال تھا، میرے ایک دوست مجھ سے ملنے آئے میں کافی پریشان بیٹھا تھا۔فیکٹری صحیح طریقے سے نہیں چل رہی تھی۔بڑے بھائی بھی کاروبار میں الگ ہو گئے تھے۔اُن کا حصہ بھی ادا کرنا تھا۔مارکیٹ کا پیسہ بھی ادا کرنا تھا، پیسہ آتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔اُن صاحب کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھے۔میں نے اپنی پریشانی بتائی تو کہنے لگے خدا کا شکر ادا کرو، اُس نے اتنی تکالیف کے باوجود آپ کی صحت پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔پھر کہا اب تمہارے خراب دن ختم ہو چکے ہیں۔اب تم نے اتنی عزت شہرت اور پیسہ دیکھنا ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے، میں نے مذاقاً کہا کیا کروڑوں روپیہ انہوں نے کہا نہیں اربوں کی باتیں کرو اور صرف پاکستان میں نہیں غیر ممالک میں بھی تمہارا کاروبار ہوگا۔جب وہ صاحب چلے گئے تو میں نے اپنے دوست کو فون کیا اور کہا یہ کون گپّی صاحب تم اپنے ساتھ لئے پھر رہے ہو یہاں لاکھوں کے لالے پڑے ہیں۔اور وہ کروڑوں نہیں

کے این اکیڈمی میں سابقہ سٹی ناظم نعمت اللہ خان کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں

اربوں کی باتیں کر گئے۔اُس دوست نے بتایا کہ راستے بھر وہ تمہارے متعلق ہی مزید باتیں بتاتے رہے یہاں تک کہا جس شخص نے اُن کو نقصان پہنچا کر فیکٹری بند کروائی تھی وہ جلدی ہی اپنے انجام کو پہنچے گا اور یہ نئے کاروبار یعنی کاسمیٹکس میں، ادویات کے کاروبار کو بھول جائیں گے۔اور یہ بھی پیشن گوئی کی کہ یہ وزیر بھی بنیں گے وغیرہ وغیرہ۔میں نے دل میں کہا کہ کاش ایسا ہو جائے تو میرا سینہ پھٹ سکتا ہے۔مگر آج اللہ کا شکر ہے کہ اس سے بھی زیادہ اللہ کا کرم مجھ پر ہو چکا ہے۔میری دُعا ہے اللہ اس کو قائم و دائم رکھے اور ایمان کی سلامتی، صحت وعافیت سے نوازتا رہے اور ہم اُس کے شکر گزار رہیں اور اُس کا حق بھی ادا کرتے رہیں (آمین)

کوتاہیاں

جہاں بہت سے فائدے نقصانات اور غلطیاں سرزد ہوئیں وہاں عملی زندگی میں بہت سی کوتاہیاں بھی ہوئیں۔اُس کا بھی مجھے احساس ہوتا ہے مثلاً اس گہما گہمی میں میں اپنے والدین کی اُتنی خدمت نہیں کر سکا جتنی مجھے کرنی چاہئے تھی، پہلے تعلیم پر توجہ دی پھر بہت ہی چھوٹی عمر میں کاروبار سے منسلک ہو گیا تھا۔14 سال کی عمر میں اندرونِ سندھ کے کاروباری دورے شروع ہو چکے تھے۔صبح اسکول، دوپہر کو والد صاحب کے ساتھ دوکان پر اور شام کو کراچی کے مضافات میں جا کر آرڈر بک کیا کرتا تھا۔دوسرے دن مال سپلائی کرتا تھا۔ہفتہ کی شام کبھی ٹھٹہ پھر کبھی حیدرآباد جا کر آرڈر بک کرتا۔اتوار کی رات کو گھر واپس آتا تھا۔اور پیر سے پھر اسکول (سندھ مدرسہ) میں تعلیم حاصل کرنے کے عمل پر گامزن۔جوں جوں کاروبار بڑھتا رہا حیدرآباد سے ٹنڈو آدم، نواب شاہ، سکھر تک دائرہ کار بڑھتا گیا۔پھر کالج کی چھٹیوں میں لاہور، پنڈی، پشاور، لنڈی کوتل تک کاروبار کا سلسلہ بڑھتا گیا۔کالج جب کھل گیا تو بھی یہ سلسلہ جاری رہا، کالج سے فارغ ہوا تو ڈھاکہ چٹاگانگ تک (مشرقی پاکستان) کاروبار کو وسعت دی

جنرل (ر) معین الدین حیدر کو اپنی کتاب پیش کرتے ہوئے

پھر 1967ء میں غیر ممالک کے دورے شروع ہو گئے یعنی صرف 23 سال کی عمر میں ہانگ کانگ کا دورہ پھر بڑھتے بڑھتے پوری دنیا کے دورے شروع ہو گئے۔ اس وجہ سے گھر والوں یعنی اپنی فیملی کو بھی مناسب وقت نہیں دے سکا۔ 1969ء میں شادی کے بعد تو دو دو ماہ بیرونی دورے پر رہا دورے بڑھتے گئے۔ کاروبار الحمدللہ بڑھتا گیا۔ مجھے احساس ہے کہ مجھے بہن بھائی، دوست احباب، عزیز و اقارب سے ملنے کا وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ صبح ½ 7 بجے فیکٹری سے رات گئے تک واپسی ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اپنے بچوں اور بیوی کے لئے بھی وقت نہیں نکال سکا۔ البتہ خبر گیری سب کی کرتا تھا۔ اکثر رشتہ داروں کے انتقال کی خبریں سفر سے واپسی پر ملتی تھیں اسی طرح رشتہ داروں کے ہاں بچوں کی پیدائش کی خبریں بھی واپسی پر معلوم ہوتی تھیں۔ شادی بیاہ میں بھی بہت کم شرکت ہوتی تھی۔ جو اچھی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مگر کاروبار میں دل ہر وقت مگن رہتا تھا۔ دین کی طرف بھی توجہ کچھ زیادہ نہیں تھی۔ البتہ رمضان کے روزے جب پاکستان میں ہوتا تو پورے رکھتا تھا۔ اکثر گرمیوں میں شیطان کہتا کہ سفر میں روزہ معاف ہے۔ تو اکثر رمضان میں غیر ممالک کے کاروباری دورے پر نکل جاتا تھا۔ عید بقرعید بھی اکثر غیر ممالک میں ہی ہوتی تھی۔ البتہ 28 سال کی عمر میں پہلا عمرہ کیا اور 29 سال کی عمر میں پہلا حج کر لیا تھا۔ نمازوں سے غفلت رہی جس کا آج بھی احساس ہے۔ پھر چھوٹے بھائی محمد عبداللہ کی نوجوانی میں انتقال پر بہت دُکھ اور افسوس ہوا تو 1992ء سے حج اور عمرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا ان 17 سال میں الحمدللہ ہر سال معہ اپنی فیملی رمضان المبارک میں عمرہ پر ضرور جاتا ہوں۔ اور الحمدللہ کافی مرتبہ حج کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ میری ان کوتاہیوں کو معاف فرمائے (آمین)

18 اکتوبر کے زلزلہ زدگان کے لئے 1 کروڑ کا چیک وزیراعظم کو پیش کر رہے ہیں